۱ سیرتِ طیّبہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ

وہ دانائے سُبل، ختم الرُّسل، مولائے کُل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

حضرت محمد رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کو ربِّ کائنات نے انسانیت کے لیے ہدایت کا آخری اور مکمل ترین سرچشمہ بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی ولادت باسعادت اور بعثت سے ایک نئے دور کا آغاز اور تاریخ کی ایک نئی جہت کا تعیّن ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم تاریخ میں آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ سے پہلے اور بعد کے زمانوں کا تقابل کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی تشریف آوری کے بعد انسانیت کلیتاً ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ ایک ایسا دور جس میں شعوروآگہی، تہذیب، ثقافت اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ اور استحکام کی وہ نظیریں ملتی ہیں جن کا آپ کی آمد سے پہلے تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب ختمِ نبوّت کا وہ ابدی فیضان تھا جو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی بعثت کے بعد آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی ذاتِ مبارکہ کے ذریعے سے عالمِ انسانیت میں جاری وساری ہوا۔

قرآنِ مجید میں واضح طور پر ہدایتِ ربّانی کو اطاعتِ رسول خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ سے مشروط قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔'' (سورۃ النّور، آیت: ۵۴) یہاں ہدایت کو اطاعتِ رسول خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ پر موقوف قرار دے کر یہ حقیقت بیان کر دی گئی ہے کہ سیرت وسنتِ نبوی خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کو اپنے اوپر لازم کیے بغیر دنیا وآخرت میں کام یابی کی کوئی اور سبیل نہیں۔ بقول شاعر:

جو کرنی ہے جہاں گیری، محمدؐ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پہ رکھ خداوندِ عجم ہو جا

اللہ تعالیٰ نے حضور خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرتِ طیّبہ کو لوگوں کے لیے اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ اور اکمل نمونہ بنایا اور پوری کائناتِ انسانی میں فقط آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ ہی کی ذات وہ نمونہ ہے جس سے ہر عمر، ہر طبقہ اور ہر دور کے لوگ زندگی کے تمام شعبوں میں رہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں، اس لیے آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی ذاتِ اقدس کو اسوۂ حسنہ یعنی بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید نے بہ صراحت یہ اعلان کر دیا ہے کہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی اطاعت ہی اطاعتِ الٰہی ہے۔

مزید یہ کہ احکامِ قرآنی کی تفصیلات وجزئیات بھی سیرتِ نبوی خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ ہی نے فراہم کی ہیں ورنہ ان احکام کی تعمیل بھی ناممکن ہو جاتی۔ جیسا کہ قرآنِ مجید نے بار بار نماز ادا کرنے کا حکم دیا، مگر نماز ادا کرنے کا طریقہ نہیں بتایا۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو اسی طرح پڑھا کرو۔'' (بحوالہ صحیح بخاری: ۶۰۰۸)

اس طرح زکوٰۃ، حج، روزہ کے احکام اور سفر کی نماز وغیرہ کی تفصیلات بھی ہمیں آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی سنّت اور آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرت ہی سے ملتی ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے معاملاتِ زندگی سراسر احکامِ شریعت ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی خلوت و جلوت، آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے شب و روز، آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی حرکت وسکون، آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی نشست و برخاست، لین دین، کلام وسکوت کا بغور مشاہدہ کرتے اور آنکھیں بند کر کے آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی اِتّباع میں لگے رہتے حتیٰ کہ دورانِ نماز قبلہ کی تبدیلی کے وقت بھی ایک لمحہ توقف کیے بغیر بیت المقدس سے مُنھ پھیر کر حضور خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی پیروی کر لی اور اپنی دولتِ ایمان میں اضافہ کر لیا۔

حضرت محمد رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی محبت ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہے۔ ایک حدیثِ پاک ہے: ''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مَیں اُسے اُس کے والدین، اولاد اور سب انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔'' گویا محبتِ رسول خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ ایمان کی شرطِ اوّل ہے، اس کے بعد ہی اطاعت اور اعمال کا دروازہ کھلتا ہے۔

قرآنِ کریم نے بھی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے اعلیٰ اخلاق کی گواہی دی ہے: ''اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔'' (سورۃ القلم، آیت: ۴)

حضور خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے خلقِ عظیم کی مثالیں سیرتِ طیبہ کی کتب میں خُوش بُو کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا ارشادِ گرامی ہے: ''بے شک مَیں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔'' (بحوالہ الموطا، ص: ۷۵۶)

نبیِ رحمت خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اپنے اہل و عیال اور نواسوں سے بے پناہ محبت فرماتے۔ یتیموں کے سر پر دستِ شفقت رکھتے، مہمانوں کی خدمت خود اپنے ہاتھوں سے کرتے، بھوکوں کو کھانا کھلاتے، محتاجوں کی مدد فرماتے، بیماروں کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے انسانوں کو غلام بنانے کی رسم کا خاتمہ کیا، اخوّت اور بھائی چارے کی بنیاد رکھی۔ دورِ جاہلیت میں عورت کی کوئی عزّت و توقیر نہ تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے عورت کو اس کے ہر روپ میں توقیر بخشی۔ اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنھا کا کھڑے ہو کر استقبال کرتے۔ یہ عزّت افزائی صرف اپنی بیٹی تک محدود نہیں تھی۔ ایک دفعہ عرب کے مشہور سردار حاتم طائی کی بیٹی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں لائی گئی تو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے مثالی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ جو والدین اپنی بیٹیوں کی صحیح پرورش اور تعلیم و تربیت کرتے ہیں اور ان کی شادی کر کے اپنے فرائض پورے کرتے ہیں، وہ جنت میں میرے ساتھ یوں کھڑے ہوں گے جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ (بحوالہ صحیح مسلم) حضور خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے عورت کو ایک ماں کی حیثیت سے اس کے قدموں تلے جنت کی نوید سنا کر وہ عزّت اور تکریم بخشی جو کسی اور معاشرے یا مذہب میں نہیں۔ گویا آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرتِ طیبہ ایک بہترین اور مثالی معاشرتی زندگی کے شان دار اصولوں کا مرقّع ہے جس سے تمام نوعِ انسان فیض یاب ہو رہی ہے۔

حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کی ہستی نہ صرف مسلمانوں کے لیے رحمت ہے بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی صلۂ رحمی اور عفو و درگزر کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے غیر مسلموں کے حقوق، جان و مال کا تحفّظ اور ان کی مذہبی روایات کا احترام مسلمانوں کے لیے لازم قرار دیا ہے اور انھیں ان کے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی مکمل آزادی بخشی ہے۔

محسنِ انسانیت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے بنی نوع انسان کے لیے عفو و درگزر، برداشت، ایثار، حکمت اور رواداری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے جو ہر دور کے لوگوں کے لیے مثالی ہیں۔ اسلام سے قبل فاتح لشکر کے لیے مفتوح قیدیوں کو قتل کر دینا اور لوٹ مار کرنے کا عام رواج تھا۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے ان قبیح رسوم کو ختم کیا، قیدیوں اور شکست خوردہ لشکر کے لیے آفاقی قوانین متعارف کرائے۔ دورانِ جنگ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ سرسبز درختوں، فصلوں اور پانی کے چشموں کو نقصان پہنچانے سے بھی منع فرمایا اور فاتح لشکر کے لیے حکم دیا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہوں اور نہ ہی کسی کھلے دروازے سے اندر جھانکیں۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم سب سے بڑھ کر دشمن کو معاف کرنے والے ہیں۔ فتحِ مکّہ کے موقع پر آپ نے مشرکینِ مکہ کے لیے عام معافی کا اعلان فرما کر سب کو اپنے گھروں میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اللہ کے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ جانوروں کے لیے بھی سراپا رحمت ہیں۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے جانوروں پر ظلم کرنے اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادنے سے منع فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا کے گھونسلے کو بھی نقصان پہنچاتا تو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم ناراضی کا اظہار فرماتے۔

سیرتِ طیّبہ ہر خاص و عام، اعلیٰ و ادنیٰ اور ہر گوشۂ حیات کے لیے ہدایت کا بہترین نمونہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی دنیا و آخرت کو خوب صورت بنا سکتے ہیں۔ پوری انسانیت کے مسائل کا حل سیرتِ طیّبہ کی اتباع میں پوشیدہ ہے۔

۲ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور دوقومی نظریہ

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِؐ ہاشمی

دوقومی نظریہ سے مُراد یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں رہتی تھیں۔ یہ قومیں ہندو اور مسلم تھیں۔ یہ دونوں قومیں سیکڑوں سال تک ایک دوسرے کے ساتھ رہی ہیں لیکن اپنے مخصوص مذہبی اور منفرد معاشرتی نظاموں کی وجہ سے باہم ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوسکیں۔

دوقومی نظریہ محض برِصغیر تک محدود نہیں ہے۔ تاریخ نے ہمارے سامنے کئی مثالیں پیش کی ہیں جیسے برطانیہ اور آئرلینڈ کی یونین، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کی آزادی۔ تاریخ نے ہمیں بہت سے جغرافیائی خطوط بھی دکھائے ہیں جو برصغیر پاک و ہند سے بہت چھوٹے تھے، جنھیں بصورتِ دیگر ایک ملک کہا جا سکتا تھا لیکن وہ سات یا آٹھ خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہوئے۔ اسی طرح پرتگالی اور ہسپانوی بھی جزیرہ نما خطے میں علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔

۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازع اور ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد سے لے کر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام تک ہندو تواتعصّب دوقومی نظریے کا سب سے بڑا محرّک ثابت ہوا جس کا باقاعدہ اعلان ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد والے (میں منعقدہ جلسے میں) اجلاس میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن (پاکستان) بنانے کی تجویز کی صورت میں کیا۔ ان کے الفاظ تھے:

> ''برِصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے الگ مملکت قائم کر دی جائے کیوں کہ دونوں اقوام کا یک جا رہنا ناممکن ہے اور نہ ہی یہ یک جا ہو کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ الٰہ آباد میں گنگا و جمنا کا پانی جس طرح الگ الگ نظر آتا ہے، اسی طرح یہ دونوں اقوام اکٹھی رہنے کے باوجود شناخت میں الگ الگ ہیں۔ ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لیے علیحدہ قومیت کا وجود ناگزیر ہے۔ ہندوستانی معاشرے کی اکائیاں یورپی ممالک کی طرح علاقائی نہیں۔ یہ خطہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی مختلف نسلوں پر مشتمل انسانی گروہوں کا ہے۔ الگ الگ قومیتی گروہوں کو تسلیم کیے بغیر پورے جمہوری اصول کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مسلمانوں کا یہ مطالبہ جائز ہے کہ ہندوستان کے اندر مسلم انڈیا کا قیام عمل میں لایا جائے۔''

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا:

> ''میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے صوبوں کو ملا کر ایک الگ ریاست بنا دی

جائے۔ برطانوی سلطنت کے اندر یا باہر خود مختار حکومت مجھے شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کا مقدّر دکھائی دیتی ہے۔''

یہ دوقومی نظریہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے روشنی کا ایسا مینار ثابت ہوا جو بعد میں تحریک پاکستان اور قیامِ پاکستان کا باعث بنا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی دوقومی نظریے کے حامی اور قائل تھے۔ ۱۹۳۰ء کی پہلی گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اب ہم ایک ایسے مقام پر آ پہنچے ہیں جہاں اگر مَیں یہ نہ بتاؤں کہ مسلمانوں کا موقف کیا ہے تو مَیں اپنے فرض سے غفلت برتوں گا۔ میں واشگاف الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں، ہندو مسلم سمجھوتا میں کوئی نیا دستور نافذ کرنے سے پہلے ایک ضروری اور ناگزیر اقدام ہے، ایک بنیادی شرط ہے، جب تک آپ مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کی ضمانت نہ دیں جس کی بنا پر وہ حکومتِ ہند کے آیندہ دستور کے تحت مکمل سلامتی اور خود مختاری محسوس کرنے لگیں۔ جب تک آپ ان کا تعاون، خلوص اور رضا مندی حاصل نہ کریں گے، اس وقت تک جو دستور بھی آپ ہندوستان کے لیے بنائیں گے، چوبیس گھنٹے بھی نہ چل سکے گا۔''

قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ جس وقت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے دوقومی نظریے کے حامی و ہم نوا بنے تو یہ نظریہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت بن گیا اور بہ تدریج عوام و خواص میں مقبول ہوتا گیا۔ الٰہ آباد کے اجلاس کے چار سال بعد جب قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ مستقل طور پر قبول کیا تو انھوں نے ہندوستان کے اندر مسلم انڈیا کے قیام کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں۔ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں مسلم لیگ کی طویل جدوجہد نے بتدریج دوقومی نظریے کی بنیاد اور اصولوں کے مراحل طے کیے۔ قراردادِ لاہور (پاکستان) ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو پیش ہوئی جس میں قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے صدارتی خطبہ ارشاد کرتے ہوئے فرمایا:

''ہندو اور مسلمان دو علیحدہ مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں جو بالکل مختلف عقائد پر قائم ہیں اور مختلف نظریات کی عکاسی کرتے ہیں۔ دونوں اقوام کے ہیروز، رزمیہ کہانیاں اور واقعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا دونوں قوموں کو ایک لڑی میں پرونے کا مقصد برصغیر کی تباہی ہے کیوں کہ یہ برابری کی سطح پر نہیں بلکہ اقلیت اور اکثریت کے روپ میں موجود ہیں۔ برطانوی حکومت کے لیے بہتر ہوگا کہ ان دونوں قوموں کے مفادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے برِصغیر کی تقسیم کا اعلان کرے جو کہ تاریخی اور مذہبی لحاظ سے ایک صحیح قدم ہوگا۔''

اسی اجلاس سے خطاب میں قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست یعنی پاکستان کو اپنی

منزل قرار دیا۔ ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن اور نسل نہیں۔ ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب وتمدّن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں، زندگی گزارنے کا اپنا ایک اسلامی فلسفۂ حیات اور زاویۂ نگاہ ہے۔ بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف ہماری قومیت کو تسلیم کرتی ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی دوقومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کے بارے میں سوچ بالکل واضح تھی۔ وہ دوقومی نظریے کے قائل اور نظریۂ پاکستان کے محرّک اور اسے عملی صورت دینے کے لیے متحرّک تھے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا بہرصورت قیام چاہتے تھے اور اس کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ گاندھی سمیت بے شمار ہندو رہ نما آپؒ کے بدترین مخالف بن گئے۔ وہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کی الگ ریاست کا قیام اور اس کا مطالبہ روکنے کے لیے ہر حد سے تجاوز کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ہندو رہنماؤں نے بے شمار حیلے بہانے تراشے اور عذر پیش کیے۔ گاندھی کے نظریات کے حامی ایک ہندو لیڈر راج گوپال اچاریہ نے قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کے الگ وطن کے نظریے کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہا:

''جناح کا مطالبہ اس طرح ہے جیسے دو بھائی ایک گائے کی ملکیت پہ جھگڑیں اور گائے کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں۔''

قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ اپنے نظریات، خیالات، ارادوں اور مقاصد کے حصول کے لیے بہت سنجیدہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں بہترین بصیرت سے نوازا ہوا تھا۔ پختہ رائے اور قوّتِ فیصلہ، ان کی شخصیت کا خاصا تھی۔ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کا حامی و ناصر ہے۔ وہ مطمئن تھے کہ قدرت نے پہلے ہی ہندوستان کو تقسیم کر رکھا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ ہندوستان کے نقشے پر مسلم اکثریت کے علاقے بہت واضح ہیں۔ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نہ تو سیاسی بازی گری کے قائل تھے اور نہ منافقت ہی پسند کرتے تھے۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے بیانات نہیں دیے۔ وہ خوب سوچ کر بولنے کے عادی تھے اور جب کوئی سیاسی بیان دیتے تھے تو اُس پر ڈٹ جاتے تھے۔ اپنے کسی سیاسی بیان سے وہ منحرف نہیں ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں گاندھی تھے جو نت نئے بہروپ میں سامنے آتے۔ وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے جیل جانا سیاسی ضرورت سمجھتے تھے۔ لیکن قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے سیاسی زندگی میں کبھی قانون شکنی نہیں کی۔ اسی لیے انگریزوں کے دل میں یہ حسرت ہی رہی کہ وہ کبھی قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا سکیں۔ وہ مروّج اصطلاح میں سیاسی رہنما نہ تھے جو لائسنسوں پرمٹوں پر بک جاتے ہیں۔ ان کے منحنی جسم میں بڑی طاقتور روح تھی۔ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ۸ / مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب میں فرمایا تھا:

''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔''

۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان سے لے کر ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء یعنی قیامِ پاکستان تک کا دورانیہ بظاہر بہت مختصر ہے لیکن اس دوران میں جو قربانیاں، جاں فشانیاں، پریشانیاں اور صعوبتیں قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ، تحریکِ پاکستان کے قائدین اور کارکنان کو برداشت کرنا پڑیں وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود نہایت استقامت سے اپنی قوم کی رہنمائی اور قیادت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ کرپس مشن، گاندھی کا یک قومی نظریہ اور اس کے خطوط، دوسری جنگِ عظیم کے آثار، سول نافرمانی کی تحریک، صوبائی اور مرکزی انتخابات، ہندوؤں اور انگریزوں کی ساز باز جیسے مسائل کے باوجود مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن پاکستان کو معرضِ وجود میں لانا، صرف اور صرف قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ جیسی معجز نما شخصیت ہی کا کارنامہ ہے۔

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مطالبہ مانتے ہوئے اعلان کیا کہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ریاست پاکستان کا قیام عمل میں لایا جائے گا اور ساتھ ہی برطانوی ہندوستان کی دو نئی سلطنتوں کے درمیان جغرافیائی تقسیم کا خاکہ بھی پیش کیا جسے ''۳ر جون کا منصوبہ'' کہا جاتا ہے۔

اللہ کے فضل و کرم سے چشمِ فلک نے وہ دن بھی دیکھا کہ جب قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی اَن تھک محنت اور مسلسل جدوجہد رنگ لے آئی۔ تحریکِ پاکستان کے قائدین اور کارکنان کی بے مثال قربانیاں مراد پا گئیں۔ علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کا سورج آزادی کی نوید لے کر طلوع ہوا۔ دنیا کے نقشے پر اسلامی جمہوریۂ پاکستان جلوہ فرما ہو گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے قائدین اپنے کارناموں سے تاریخ تبدیل کرتے ہیں لیکن قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ وہ رہنما ہیں جنھوں نے تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیہ بھی تبدیل کر کے دکھایا اور کروڑوں مسلمانوں کی تقدیر بدلتے ہوئے ایک اسلامی نظریاتی اور فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔

ربِّ کریم سے دعا ہے کہ ہمارا وطن تا قیامت سلامت رہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

❸ پاکستان میں آبادی کے مسائل

اِک اور کھیت پکّی سڑک نے نِگل لیا
اِک اور گاؤں شہر کی وُسعت میں کھو گیا

پاکستان کے بڑے مسائل میں آبادی کی زیادتی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک ہماری آبادی کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ حالیہ مردم شماری ۲۰۲۳ء کے مطابق پاکستان کی آبادی ۲۴ کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ آبادی کے اس اضافے کی وجہ سے ارضِ پاک کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ قومی وسائل کا استعمال حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ وسائل اور مسائل کا عدم توازن زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ بچوں اور بچیوں کی تعلیم کو لیجیے۔ آج سکول، کالج اور یونی ورسٹیاں طلبہ سے بھری پڑی ہیں لیکن فارغ التحصیل نوجوانوں کے پاس روزگار کے مواقع موجود نہیں۔ زراعت کے وسائل کو دیکھ لیں، ہماری تقریباً ستر فی صد آبادی دیہات میں ہے اور ہمارے ملک کا بنیادی ذریعہ آمدن زراعت ہے۔ اس کے باوجود چینی اور آٹے جیسی اجناس بھی ہمیں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ ریلوے کو دیکھ لیں، سوار ہونے کو جگہ نہیں ملتی، بسیں اوورلوڈ نظر آتی ہیں اور ٹرانسپورٹ بھی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ لوگوں کو ہر بڑی سڑک پر اکثر ٹریفک جام کا سامنا رہتا ہے۔ سرکاری ہسپتال مریضوں سے بھرے پڑے ہیں، برآمدوں میں بھی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مساجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے جائیں تو سڑکوں اور گلیوں میں نمازیوں کے لیے صفیں بچھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

آبادی کی زیادتی نے آمدنی کے ذرائع کم کر دیے ہیں۔ کم آمدن کا اثر یقینی طور پر صحت، تعلیم، غذا اور ہر شعبۂ حیات پر پڑ رہا ہے۔ بچوں کی صحت بہت خراب اور ناقص ہو چکی ہے۔ ان کے چہرے زرد، جسم کم زور، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ گرمی ہو یا سردی، ان کے بدن پر مناسب لباس نہیں ہوتا۔ دسمبر اور جنوری کی سخت سردی میں جسم ڈھانپنے کے لیے گرم لباس نہیں ہے۔ گھروں میں موجود بچوں کو، جن کا جسم بہ تدریج نشوونما کے مراحل میں ہوتا ہے، ضرورت کے مطابق خوراک نہیں ملتی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، ذہنی نشوونما اور جسمانی بالیدگی رک گئی ہے۔ ان کی پڑھائی کے لیے کتابیں، کاپیاں، سٹیشنری کا سامان، یونی فارم، صاف ستھرے لباس اور فیس کی ادائیگی کے لیے رقم میسّر نہ ہے۔

تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی میں صرف یہی خرابی نہیں کہ لاکھوں کی تعداد میں بچے مناسب خوراک، لباس اور تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ لاکھوں افراد کے قیام و طعام کا مسئلہ بھی شدّت اختیار کر چکا ہے۔ ایک آٹھ مرلے کا مکان جو کبھی چار افراد پر مشتمل ایک فیملی کی ملکیت تھا، وہاں افراد کی تعداد آٹھ ہو گئی اور وہ چار فیملیز میں بٹ گیا تو جگہ دو دو مرلے رہ گئی۔ مکانوں میں گنجائش ختم ہو گئی اور لوگ نئی قیام گاہیں تعمیر کرنے کے لیے اضافی بستیاں بنانے میں مگن نظر آنے لگے۔ اضافی بستیاں، ٹاؤن اور کالونیاں اتنی بڑھ چکی ہیں کہ زیرِ کاشت رقبہ تیزی سے سکڑتا جا رہا ہے۔

سرکاری محکموں میں ملازمت کے مواقع ناپید ہو چکے ہیں۔اس کا سبب بھی آبادی میں ناقابلِ یقین اضافہ ہے۔کسی بھی ادارے میں چند خالی اسامیاں مشتہر ہونے کی دیر ہوتی ہے،نوجوانوں کا ایک جمِ غفیر امڈ آتا ہے۔دو دو اسامیوں پر دو دو ہزار امیدوار جوتیاں چٹخاتے پھرتے نظر آتے ہیں۔درجۂ چہارم کی نوکری سے لے کر گزٹیڈ آفیسر کی نوکری تک یہی عالم ہے۔کھیتوں میں کام کرتے مزارع دیکھ لیجیے،جدید زرعی آلات نے ان کی ضرورت کم کر دی ہے اور بے ہنگم آبادی نے ان کی دست یابی بڑھا دی ہے۔وہ بے چارے جو ربیع اور خریف کی فصلوں کی کاشت اور کٹائی کر کے سال بھر کا اناج اکٹھا کر لیتے تھے،اب اس سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔صنعت کو دیکھ لیجیے،ہزاروں کاری گر سیلاب کی صورت صبح سویرے گاؤں سے شہر کی طرف اور شام کو شہر سے گاؤں کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں،ان میں سے چند ایک خوش قسمت ہوں گے جنھیں کسی فیکٹری یا کارخانے سے باقاعدہ روزگار میسّر ہو۔شہروں کے محلّوں اور بازاروں میں مزدوروں کی بے شمار ٹولیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ایک مزدور کی ضرورت ہو تو بیسیوں گھیرا ڈال لیتے ہیں۔اس کا سبب کیا ہے؟ یقیناً حد سے بڑھی ہوئی آبادی۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ اس صورتِ حال میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟

آبادی کے اس گمبھیر مسئلے کے دو ہی حل ہیں،یا تو وسائل آبادی کے مطابق ہو جائیں یا پھر آبادی وسائل کے مطابق ہو جائے۔جہاں تک وسائل بڑھانے کی بات ہے تو اس کے لیے قیامِ پاکستان سے اب تک کوششیں جاری ہیں۔وسائل کسی قدر بڑھے بھی ہیں تو ان سے کئی گنا بڑھتی ہوئی آبادی کی نذر ہو گئے ہیں۔آج بھی پٹرول،کیمیکل،ادویات اور مشینری درآمد کی جا رہی ہے۔حالات نے ثابت کیا ہے کہ ہم وسائل کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے مطابق نہیں کر سکے۔پس ہمیں دوسری تدبیر کو اپنانا ہوگا یعنی آبادی کو وسائل کے مطابق کیا جائے۔اس لیے ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی طرح آبادی اور وسائل کے درمیان توازن کا شعور پیدا کیا جائے۔یہ شعور بڑوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو بھی حاصل ہونا چاہیے جو جلد ہی عملی زندگی میں قدم رکھنے جا رہے ہوں۔

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو،منصوبہ بندی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔صنعت،تجارت،زراعت،تعلیم و تربیت خواہ کوئی شعبہ ہو،اسے منصوبہ بندی کی احتیاج ہے۔اسی طرح بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے منصوبہ بندی ناگزیر ہے ورنہ جس قدر نئے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کی جا رہی ہیں اور زرعی پیداوار بڑھانے کی مہمات زور شور سے جاری ہیں،سب سعیِ لا حاصل ہوگی،ہمارا معیارِ زندگی بہتر نہ ہو پائے گا اور ہمارے وسائل بھی اکارت جائیں گے۔

۳ زراعت وصنعت

یہ کھیت، یہ درخت، یہ شاداب گِرد و پیش
سیلابِ رنگ و بُو سے یہ سیراب گِرد و پیش

زراعت ایسے پیشے، علم یا فن کو کہتے ہیں جس کا تعلق کاشت کاری اور لائیواسٹاک یعنی دودھ، گوشت اور انڈوں وغیرہ کی پیداوار سے ہو۔ گویا فصلوں اور مال مویشیوں کی صورت میں پیداوار حاصل کرنے والا شعبہ، زراعت کا شعبہ کہلاتا ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اس لیے زراعت کا شعبہ معاشی حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل شعبہ ہے۔ پاکستان میں جو فصلیں کاشت کی جاتی ہیں، انھیں ''خریف'' اور ''ربیع'' کی فصلیں کہتے ہیں۔ ''خریف'' خزاں کا موسم ہے۔ اس موسم کا دورانیہ جون سے اکتوبر تک ہے۔ اس موسم میں سویابین، مکئی، باجرہ، جوار، کپاس اور چاول جیسی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ ''ربیع'' بہار کا موسم ہے۔ اس موسم کا دورانیہ نومبر سے اپریل تک ہے۔ اس موسم میں گندم، چنے، سرسوں، اور جَو وغیرہ کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔

۲۰۲۳ء کی مردم شماری کے مطابق ہمارے ملک کی آبادی کا نصف سے زائد حصہ دیہات میں مقیم ہے۔ اس آبادی کی اکثریت زراعت سے وابستہ ہے۔ اگر پاکستان کے برسرِ روزگار افراد کا تناسب دیکھا جائے تو ان میں سے تقریباً ۴۲ فی صد کا روزگار زراعت سے جڑا ہوا ہے۔ ہماری زمینیں ہمیں خوراک فراہم کرتی ہیں، نقد آور فصلیں ملکی صنعتوں کی بنیاد بنتی ہیں اور روزگار کا ذریعہ بھی۔ غذائی خود کفالت کے قابل بنانے میں معاونت فراہم کرتی ہیں اور ہریالی اور سبزے کی صورت میں ہمیں ماحولیاتی آلودگی سے تحفُّظ فراہم کرتی ہیں۔ لہٰذا پاکستان کا زرعی شعبہ جتنا زیادہ ترقی کرے گا اتنا ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی خوش حالی کا باعث بنے گا۔ آبادی کے لحاظ سے اس وقت ہم دنیا کے ساتویں بڑے ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ آبادی مزید تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ زراعت ہی ہے جو اتنی بڑی آبادی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں کردار ادا کر رہی ہے۔

زراعت کا صنعت سے گہرا تعلق ہے۔ جہاں تک صنعت کا تعلق ہے تو اس سے مراد خام مال کو کارآمد اشیا میں تبدیل کرنا صنعت ہے۔ زراعت کا شعبہ مختلف اجناس کو خام مال کی صورت میں فیکٹریوں اور کارخانوں کو فراہم کرتا ہے تاکہ کھانے پینے اور دوسری روزمرّہ ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ یہ فیکٹریاں اور کارخانے گندم کو آٹے، میدے، سوجی اور دلیے وغیرہ میں تبدیل کر کے کھانے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح مختلف دالوں کو قابلِ استعمال بنایا جاتا ہے۔ کپاس روئی، دھاگے اور کپڑے کی شکل میں ہماری ضروریاتِ زندگی پوری کرتی ہے۔ گندم کی چھانٹ سے حاصل شدہ چوکر، ممنی (مختلف جڑی بوٹیوں کے بیج) اور دالوں کے چھلکے مویشیوں کا بہترین چارہ بنتے ہیں۔ کپاس کے بیج سے تیل نکالا جاتا ہے اور اس سے مویشیوں کے لیے کھل بنولہ بھی تیار ہوتی ہے۔ چاول اور مکئی نہ صرف ہماری روزمرہ خوراک کا اہم حصہ ہیں بلکہ ان سے بچوں اور بڑوں کے لیے مزے دار مشروبات، بسکٹ، ٹافیاں اور گولیاں وغیرہ بھی تیار کی

جاتی ہیں۔ گنّا شوگر ملّوں میں جا کر ایک طرف چینی اور شکّر کی صورت اختیار کرتا ہے تو دوسری طرف اس کا پھوک گتا سازی وغیرہ کے لیے بھی استعمال میں آتا ہے۔ سرسوں، کینولا اور سورج مکھی سے خوردنی تیل حاصل کیا جاتا ہے اور ان کا پھوک جانوروں کی خوراک بنتا ہے۔ سبزیاں، پھل اور ان کے بیج نہ صرف بھرپور غذائیت فراہم کرتے ہیں بلکہ انھیں مختلف طریقوں سے مشروبات اور ادویات کے طور پر بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ درختوں کی لکڑی سے عمارتی ساز و سامان اور فرنیچر تیار کیا جاتا ہے۔ یوں زمینی پیداوار کی صورت میں حاصل شدہ خام مال کارآمد اشیا میں تبدیل ہو کر صنعت کی صورت اختیار کرتا ہے۔

لائیو اسٹاک سے مراد مال مویشی پالنا ہے۔ گھروں میں مرغیاں، بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں وغیرہ پالی جاتی ہیں۔ اسی طرح پولٹری فش، گوٹ اور ڈیری فارمنگ میں جدید سائنسی بنیادوں پر مال مویشی پالے جاتے ہیں جو انڈے، دودھ اور گوشت کی فراہمی کے ساتھ ساتھ دیگر مصنوعات کی تیاری میں بھی خام مال فراہم کرتے ہیں۔ دودھ اور گوشت بچوں کی افزائش اور بڑوں کی صحّت کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ زراعت کا شعبہ آبادی کی اس بنیادی ضرورت کی فراہمی کو ممکن بنائے ہوئے ہے۔

ریشم کے کیڑے پالنا بھی ایک نفع بخش کاروبار اور دل چسپ مشغلہ ہے۔ چین کے بعد پاکستان میں ریشم سازی کی صنعت ترقی کی جانب گامزن ہے۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں قدرتی ماحول کے ساتھ ساتھ مصنوعی چھتوں میں بھی پرورش پاتی ہیں۔ چوں کہ شہد غذا بھی ہے اور دوا بھی، اس لیے شہد کی طلب کے پیشِ نظر پہاڑی مکھی، مغربی مکھی، ڈومنا (بڑی مکھی) اور چھوٹی مکھی کی افزائش پر پاکستان میں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور شہد کی پیداوار میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

موسم ربیع میں گندم، سرسوں، توریا، چنا اور مسور جیسی فصلیں بارانی علاقوں میں نمایاں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان فصلوں کو نقصان دینے والی جڑی بوٹیوں کو چار گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں چوڑے پتے والی (پالک جیسی)، دوسرے گروپ میں گھاس، تیسرے گروپ میں باریک پتوں والی جنگلی گندم وغیرہ اور چوتھے گروپ میں نوک دار پتوں والی جنگلی جئی، دنبی سٹی جیسی جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں فصل کی کاشت سے لے کر بڑھوتری، کٹائی، گہائی اور منڈی تک ہر مرحلے پر مختلف طریقوں سے نقصان کا سبب بنتی ہیں۔ ان میں جڑی بوٹیوں کا جدید سائنسی اصولوں کے مطابق خاتمہ کر کے بہتر پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی طلب کے مطابق زرعی پیداوار میں اضافہ ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے۔ عوامی اور حکومتی سطح پر اس سلسلے میں بے شمار اقدامات کیے جا چکے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔ زمینی پیداوار کی بہتری کے لیے کھادیں، معیاری بیج، مشینری کا استعمال، آب پاشی اور ادویات کا کردار کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ ہمارے کسان خود بھی اپنے تجربات کی روشنی میں ان وسائل کے استعمال کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور حکومت بھی ہر چھوٹے بڑے کسان تک ان وسائل کی بہترین فراہمی کو یقینی بنا رہی ہے۔ بیج بونے سے لے کر فصلوں کی کٹائی اور گہائی تک کے تمام مراحل کو بہتر بنانے کے لیے جدید مشینری فراہم کی جا رہی ہے۔ آب پاشی کی بہتری

کے لیے نہری نظام کو مؤثر بنایا گیا ہے اور بارانی علاقوں کے زمینداروں کو ٹیوب ویل کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ٹریکٹر، تھریشر اور ہارویسٹر وغیرہ فراہم کر کے فصلوں کی بوائی، کٹائی اور گہائی کو بہت بہتر بنا دیا گیا ہے۔کسانوں کو آسان شرائط پر قرضے دیے جا رہے ہیں اور زرعی علم و ہنر میں اضافے کے لیے مختلف تربیتی پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔زرعی شعور کو اجاگر کرنے کے لیے ملک بھر میں زرعی جامعات اور زرعی ترقیاتی ادارے بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔عوامی اور حکومتی سطح پر ماڈل فارمز بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور کی فی ایکڑ پیداوار پرانے دور کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔قدیم دور کی نسبت جدید دور میں بیج بونے کا طریقِ کار بہت بہتر ہے۔پہلے پہل بیج بونے کے لیے کسان بیلوں کی مدد سے ہل چلاتا تھا اور سخت محنت کرتا تھا۔اس کے باوجود پیداوار بہت کم ہوتی تھی۔آج ٹریکٹر کے ذریعے سے زمین میں ہل چلایا جاتا ہے، بیج بوئے جاتے ہیں اور تھوڑی محنت سے بہتر فصل کاشت کی جاتی ہے۔

اسی طرح فصلوں کی کٹائی اور گہائی کے طریقِ کار میں بھی جِدّت آ چکی ہے۔ ہارویسٹر اور تھریشر وغیرہ کے استعمال سے نہ صرف وقت اور زیادہ مشقّت کی بچت ممکن ہو چکی ہے بلکہ پیداوار کا ضیاع بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ ماڈل فارم حکومتی اور عوامی ہر دو سطح پر بنائے جاتے ہیں۔ان ماڈل فارمز میں جدید سائنسی اصولوں کے مطابق کاشت کاری کی جاتی ہے۔مخصوص زرعی رقبے پر قائم یہ فارم تمام کسانوں کے لیے بہترین نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔کسان ان فارموں میں فصلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ فصلیں کیسے اگائی جاتی ہیں؟ کس طرح کی کھادوں کا استعمال کیا جاتا ہے؟ فصلوں کو موسموں کی شدّت سے کیسے بچایا جاتا ہے؟ کون سی ادویات فصلوں کو کیڑوں مکوڑوں اور بیماریوں سے بچا کر زیادہ پیداوار کا سبب بنتی ہیں؟ آج کل تو ایسے گرین فارم بھی بنائے جا رہے ہیں جہاں بے موسمی سبزیوں اور پھلوں کی کامیابی سے کاشت کی جا رہی ہے۔اب ہم کسی بھی موسم میں ہر قسم کی سبزی اور پھل اپنی خوراک کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

سرسبز و شاداب پاکستان ہماری خوش حالی کا ضامن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سونا اگلنے والی زمینوں سے نوازا ہے۔ سرزمینِ پاکستان نہ صرف میدانی علاقوں میں زرخیز ہے بلکہ اس کے پہاڑ بھی سرسبز و شاداب ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بہترین منصوبہ بندی کر کے زراعت کو صنعت بناتے ہوئے اس مملکتِ خداداد کی خوش حالی کو یقینی بنائیں۔زرعی مصنوعات کی درآمدات کے بجائے برآمدات کو فروغ دیں اور زرِمبادلہ کی صورت میں اپنے پاک وطن کی معیشت کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں۔

۵ پاکستان کا قومی کھیل

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

مشہور قول ہے کہ اگر کھیل کے میدان آباد ہو جائیں تو ہسپتال ویران ہو جاتے ہیں۔ کھیل انسانی جسم کو تندرست و توانا بناتے ہیں اور بے شمار انسانی اوصاف پیدا کرتے ہیں۔ خود اعتمادی، باہمی احساس، تحمّل، بردباری، وقت کی پابندی اور نظم وضبط جیسی کتنی ہی صفات ہیں جو کھیلوں کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: العقل السلیم فی الجسم السلیم ۔ ''یعنی: صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔'' گویا تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل بھی ضروری ہیں۔

میدان کے لحاظ سے کھیلوں کو تقسیم کیا جائے تو یہ دو قسم کی ہوتی ہیں یعنی اِن ڈور اور آؤٹ ڈور۔ شطرنج، کیرم بورڈ، سنوکر، ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن اور سکواش وغیرہ کا تعلق اِن ڈور کھیلوں سے ہے جب کہ ہاکی، فٹ بال، باسکٹ بال، والی بال، کبڈی اور رسّہ کشی وغیرہ آؤٹ ڈور کھیلیں ہیں۔ کھیل کوئی بھی ہوں اور کسی میدان میں بھی کھیلے جائیں، ہمارے ذہن اور جسم کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کھیلنے سے دماغ تر و تازہ ہوتا ہے اور قائدانہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ کھیل کے قواعد و ضوابط کھلاڑی کو نظم وضبط کا پابند بناتے ہیں۔ کھیلوں سے ایک طرف تو کھلاڑیوں میں تحمّل، بردباری، برداشت، دوسروں کا احساس، فرماں برداری اور باہمی تعاون جیسے جذبات پروان چڑھتے ہیں جب کہ دوسری طرف وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا سیکھتے ہیں۔

فٹ بال کے ساتھ ساتھ ہاکی کا کھیل بھی دنیا بھر میں مقبول ہے۔ ہاکی کا میدان اگرچہ فٹ بال کے میدان سے قدرے چھوٹا ہوتا ہے مگر دلچسپی کے لحاظ سے کسی طور کم نہیں۔ فٹ بال کی طرح ہاکی کی ٹیم بھی گیارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس میں بھی دو ریفری ہوتے ہیں۔ عالمی معیار کے مطابق ہاکی کے میدان کی لمبائی ایک سو گز اور چوڑائی ساٹھ گز ہوتی ہے۔ کھلاڑی مجوزہ معیار کے مطابق بنی ہوئی ہاکی اور گیند سے کھیلتے ہیں جب کہ کھیل کا دورانیہ ۷۰ منٹ ہوتا ہے جس کا پہلا اور دوسرا ہاف ۳۵، ۳۵ منٹ کا ہوتا ہے۔ پہلے ہاف کے بعد دونوں ٹیمیں اپنی سائیڈز تبدیل کر لیتی ہیں۔

ہاکی ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کا قومی کھیل ہے۔ پاکستان کے علاوہ یہ کھیل ایشیائی ممالک جیسے بھارت، چین، جاپان، جنوبی کوریا وغیرہ میں بہت مقبول ہے۔ اس کے علاوہ ہالینڈ، انگلینڈ، پولینڈ، سپین، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں بھی اس کھیل کی بے حد مقبولیت ہے۔ تاریخی لحاظ سے ہاکی کا کھیل انیسویں صدی میں مقبول ہوا۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۰ء کے اولمپک مقابلوں میں ہاکی کا کھیل شامل تھا۔ ۱۹۲۸ء کے بعد اسے اولمپک کھیلوں کے ہر ٹورنامنٹ میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ہاکی کا کھیل ایشین گیمز میں شامل ہوا۔ ہاکی کے ورلڈ کپ کا آغاز ۱۹۷۱ء میں کیا گیا۔ ہاکی کے بڑے ٹورنامنٹس میں اولمپکس مقابلہ جات کے ساتھ ساتھ ورلڈ کپ، چیمپینز ٹرافی، ایشیا کپ اور سیف گیمز شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک پورے یورپ میں یہ کھیل مقبول ہو چکا تھا۔

ہندوستان میں برطانوی فوج نے ہاکی کا کھیل متعارف کرایا۔ برِ اعظم ایشیا میں پہلے پہل پاکستان اور ہندوستان کی صرف دو نمائندہ ٹیمیں تھیں۔ جاپان، ملائشیا، جنوبی کوریا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کی ہاکی ٹیمیں بعد میں منظرِ عام پر آئیں۔

پاکستان کی ہاکی ٹیم پہلی بار ۱۹۴۸ء میں بین الاقوامی مقابلوں میں علی اقتدار دارا کی کپتانی میں شامل ہوئی جو قیامِ پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان کی طرف سے بھی کھیل چکے تھے۔ اس ٹورنامنٹ میں پاکستان نے چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء کے میلبرن اولمپکس میں پاکستانی ہاکی ٹیم نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائنل تک رسائی حاصل کی اور سلور میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۶۰ء کے روم اولمپکس میں پاکستان نے عبدالحمید حمیدی کی قیادت میں پہلا اولمپک گولڈ میڈل حاصل کر کے بھارت کی ۳۲ سالہ بالا دستی کا خاتمہ کیا۔ یہ وہ تاریخی فتح تھی جس نے ہاکی کو پاکستان کا قومی کھیل بنا دیا۔ ۱۹۶۸ء کے میکسیکو اولمپکس میں پاکستان نے طارق عزیز کی قیادت میں آسٹریلیا کو فائنل میچ میں شکست دے کر اور ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلس اولمپکس میں منظور جونیئر کی قیادت میں جرمنی کو شکست دے کر گولڈ میڈل حاصل کیے۔ پاکستان نے اب تک پندرہ بار اولمپکس کے ہاکی مقابلوں میں حصہ لیا ہے اور تین سونے، تین چاندی اور دو کانسی کے تمغے حاصل کیے ہیں۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم نے ۱۹۷۱ء میں پہلا ورلڈ کپ، ۱۹۷۸ء میں دوسرا، ۱۹۸۲ء میں تیسرا اور ۱۹۹۴ء میں چوتھا ورلڈ کپ جیتا۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم نے سب سے زیادہ بار یعنی چار بار ورلڈ کپ جیتا جو ایک ریکارڈ ہے۔ اس کے علاوہ چیمپئنز ٹرافی، ایشیا کپ اور سیف گیمز میں بھی متعدد تمغے حاصل کر کے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔ ہاکی کی وجہ سے پاکستانی پرچم کئی عشروں تک پوری دنیا کے میدانوں میں لہراتا رہا۔ ہاکی کے میدان میں مجموعی طور پر پاکستان تین اولمپکس گولڈ میڈل، چار ورلڈ کپ، تین چیمپئنز ٹرافی، تین اذلان شاہ ہاکی ٹورنامنٹ گولڈ میڈل اور آٹھ ایشین گیمز گولڈ میڈل اپنے نام کر چکا ہے۔

پاکستانی ٹیم عرصۂ دراز تک ناقابلِ شکست سمجھی جاتی رہی۔ ماضی میں پاکستانی کھلاڑیوں کے کھیلنے کا انداز اور کارکردگی قابلِ ستائش تھی۔ اُس وقت قدرتی گھاس پر پاکستان کا ایشیائی ہاکی اسٹائل بہت مقبول تھا جس کے سامنے یورپی ٹیمیں بے بس نظر آتی تھیں۔ جب یورپی ٹیموں نے آسٹروٹرف اور پولی ٹرف کو قدرتی گھاس کے متبادل کے طور پر متعارف کرایا تو ایشیائی اسٹائل اتنا کامیاب نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے کھلاڑی سخت محنت کے باوجود وہ نتائج حاصل نہیں کر پا رہے جو ماضی میں ان کا طرّۂ امتیاز تھا۔ ماضی میں نصیر بندہ، اصلاح الدین، منور زماں، سلیم شیروانی، سمیع اللہ، شہناز شیخ، حسن سردار، حنیف خان، شہباز سینئر، کلیم اللہ، سمیع اللہ، منظور جونیئر، قاضی محب اور شہباز جونیئر جیسے عالمی شہرت یافتہ پاکستانی کھلاڑی وطنِ عزیز کی نمایندگی کر چکے ہیں۔

ہاکی کے میدان میں پاکستان کی پہچان خواتین کی ہاکی ٹیم بھی ہے۔ پاکستان کی ویمن ہاکی ٹیم متعدد بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت کر کے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر چکی ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں خواتین کی قومی ہاکی ٹیم بھی پاکستان کے لیے بڑے عالمی اعزازات جیتنے میں کامیاب ہوگی۔ مقامی ہاکی کلبوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر ہاکی کو فروغ دینے کے لیے مؤثر اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں۔ امید ہے پوری دنیا میں پاکستان ہاکی کی کھوئی ہوئی ساکھ ایک بار پھر بحال ہوگی۔ ان شاءاللہ!

٦ تعلیمِ نسواں

تعلیمِ نسواں عربی زبان کے دو الفاظ ''تعلیم'' اور ''نسواں'' کا مرکب ہے۔ تعلیم کے معنی ہیں علم حاصل کرنا جب کہ نسواں کا لفظ نسا سے نکلا ہے جس کا معنی ہے عورت۔ گویا عورتوں کا علم حاصل کرنا تعلیمِ نسواں کہلاتا ہے۔ علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کیوں کہ بنی نوع انسان اگر اشرف المخلوقات ہے تو علم ہی کی وجہ سے، وہ اپنی تخلیق کے بعد اگر مسجودِ ملائک اور واجب التعظیم بنا تو علم ہی کی بِنا پر۔ علم وہ موضوع ہے جو زندگی کا ہمہ اطراف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو تقسیم کرنے سے بڑھتی ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جس سے جہالت کے اندھیرے چھٹتے ہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جس سے کائنات کے بھید کھلتے ہیں اور اس کے خفیہ خزانے دریافت ہوتے ہیں۔ علم ایک بے کنار سمندر ہے۔ یہ انسان کو خود شناسی سے خدا شناسی کی طرف راغب کرتا ہے لیکن موضوع بحث صرف علم کا حصول نہیں بلکہ تحصیلِ تعلیمِ نسواں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت بنی نوعِ بشر سے متعلق نہیں؟ کیا وہ آدمیت اور انسانیت سے خارج ہے؟ یقیناً نہیں۔ وہ اولادِ آدم اور بنتِ حوّا ہے۔ وہ اس کائنات کا جمال اور شاہ کار ہے۔ عورت ایک دل کش وجود کا نام ہے۔ وہ اس گردشِ لیل ونہار میں سوز وسازِ زیست کا نہایت اثر آفریں اور کیف آور نغمہ ہے۔ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

کسی بھی معاشرے کے قیام کے لیے مرد اور عورت لازم وملزوم ہیں۔ دونوں کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مرد خاوند ہے، باپ ہے، بیٹا ہے، بھائی ہے تو عورت بیوی ہے، ماں ہے، بیٹی ہے اور بہن ہے۔ بیوی کا اپنے خاوند سے خونی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ خونی رشتوں کو جنم دیتی ہے۔ وہ ماں کے روپ میں دنیا کی خوب صورت ترین مخلوق ہے کیوں کہ کوئی ماں بدصورت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے گھر جنّت نظیر ہے۔ وہ بیٹی ہے تو ماں باپ کے گھر کی رحمت اور رونق، وہ بہن ہے تو بھائیوں کے لیے ماں کی طرح سراپا محبت، سراپا ایثار اور سراپا مروّت۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے — ملکوں کی بستی ہو تمھی، قوموں کی عزّت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں — غمگیں دلوں کی شادیاں، دُکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن، تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس، جینے کی حلاوت تم سے ہے

یقیناً اچھی بیوی ہی اچھی ماں بنتی ہے، اچھی ماں اچھی بیٹی کی ضامن ہے اور اچھی بیٹی ہی اچھی بہن ثابت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ عورت کا اپنے ہر روپ میں اچھا ہونا کیوں کر ممکن ہے؟ یقیناً علم ہی وہ زیور ہے جو قدرت کی اس خوب صورت تخلیق کو کائناتِ ارضی کا شاہکار بناتا ہے۔ علم اچھے اور اوچھے میں حدِ فاصل ہے۔ اس حد کو سر کر کے اپنے وجود کی سرحد بنانا مرد اور عورت دونوں کے لیے ناگزیر ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں ارشاد فرماتا ہے کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؟ اسی طرح رسول اکرم خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا ارشادِ گرامی ہے: ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔'' (بحوالہ شعب الایمان) جب قرآن اور حدیث کے مخاطب مرد اور عورت دونوں ہیں، معاشرے کی ابتدا کا ماخذ مرد اور عورت دونوں ہیں، کاروبارِ زیست کے محافظ مرد اور عورت دونوں ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ مرد تو علم وفن سے اپنی شخصیت کو مزیّن کر لے اور عورت زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو۔

درحقیقت مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ یہ جب تک ہموار رہیں زندگی کی گاڑی اُس وقت تک پرسکون طور پر رواں دواں ہے۔ جہاں ان میں بگاڑ آیا زندگی جہنم زار بن گئی۔ اس لیے ایک پڑھی لکھی عورت ہی ایک اچھی، بہتر اور مثالی بیوی ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی بیوی ہی حیاداری کے تمام تقاضے پورے کرسکتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کی ضروریات، جذبات اور احساسات کو پوری طرح سمجھ سکتی ہے۔ وہ خاوند کی پسند و ناپسند معلوم کر کے اس کے لیے سکون کا باعث بن سکتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی بیوی ہی شیریں زبان کی حامل، تحمّل مزاج اور نرم خو ہوسکتی ہے۔

وہ گھر میں چادر اور چار دیواری کے تحفّظ کی ضامن ہے۔ مُلازم ہے تو زندگی کی منصوبہ بندی کر کے اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو گھر کے ماحول پر اثر انداز نہیں ہونے دیتی بلکہ عہدِ حاضر کے معاشی معاملات میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ روایتی عورتوں کی طرح ایک ہی مرد پر تا دمِ زیست پورے گھر کی کفالت کا بوجھ نہیں لادتی۔ وہ اگر ملازمت نہیں بھی کرتی تو گھریلو معاملات ایک ماہرِ اقتصادیات کی طرح نباہتی ہے اور گھر کو ہر قسم کے مسائل سے محفوظ رکھتی ہے۔

دینی اور معاشرتی ہر دو پہلوؤں سے دیکھیں تو عورت کا روپ بحیثیت ماں بے مثال اور لاثانی ہے۔ ماں کو جتنی توقیر اسلامی تناظر میں حاصل ہے کسی اور ضابطے میں ممکن نہیں۔ جنّت کو ماں کے قدموں تلے رکھ دیا گیا ہے۔ انسانی پہلو سے بھی غور کریں تو ماں انسانیت کا ماخذ ہے۔ بچے کی پیدائش، پرورش، بڑھوتری اور نشوونما، کون سا ایسا پہلو ہے جس کی احتیاج ماں پورا نہیں کرتی۔ یہی ماں جس کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے، اگر تعلیم یافتہ ہو تو کتنا ترقی یافتہ، صحت منداور خوش حال معاشرہ منظرِ عام پر رونما ہوگا۔ نپولین نے جب یہ بات کہی تھی کہ تم مجھے اچھی مائیں دے دو، میں تمھیں اچھی قوم دے دوں گا تو اس سے بھی یہی مراد تھی کہ اچھی ماں ہی اولاد کی اچھی تربیت کرسکتی ہے۔

تعلیم ہر بیٹی کا بنیادی حق ہے جس کی ادائیگی والدین اور معاشرے کا اوّلین فریضہ ہے۔ بیٹی کی عظمت و اہمیت کے پیشِ نظر دینِ اسلام نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین اصول وضع کیے ہیں۔ عہدِ نبوی خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ میں مردوں کے وعظ و نصیحت کی طرح عورتوں کے لیے بھی خاص دن مقرر تھا جس میں وہ رسولِ اکرم خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ سے فرمودات عالیہ سماعت کرتی تھیں۔ ہادیِ عالم خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا فرمان ہے: ''جو شخص لڑکیوں کی پرورش سے دوچار ہو، پھر اُن کی پرورش سے آنے والی مصیبتوں پر صبر کرے تو یہ سب لڑکیاں اس کے لیے جہنم سے آڑ بنیں گی۔'' (جامع ترمذی: ۱۹۱۳) آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرتِ طیبہ، ارشادات اور تعلیمات اس امر کے متقاضی

ہیں کہ بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں عادلانہ طرزِفکر وعمل اپنایا جائے۔

عورت، خاندان اور معاشرہ کاروبارِ زیست کے تسلسل کی بنیادی اکائیاں ہیں۔عورت خاندان کی بنیادی اکائی ہے اور خاندان معاشرے کی۔عورت پڑھی لکھی، مہذب اور سلیقہ شعار ہوگی تو خاندان کی اندرونی اور بیرونی حالت بعینہٖ بہتر ہوگی۔ایسا خاندان معاشرے کو بالغ نظر، مہذب اور مفید شہری فراہم کرے گا۔گویا عورت بہترین معاشرے کے آغاز وارتقا کا لازمی جزو ہے اس لیے اس کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہر معاشرے کی اوّلین ذمہ داری ہے۔اس ذمہ داری کو پسِ پشت ڈالنا مجرمانہ غفلت کا ارتکاب ہوگا۔عورت اگر تعلیم وتربیت کی صفات سے متّصف ہے تو اس کے اوصاف معاشرے کے افراد سے منعکس ہوں گے اور معاشرہ نقطۂ کمال کو پہنچے گا بصورتِ دیگر مذہبی، اخلاقی، فکری، فنی اور زندگی کے عملی پہلوؤں میں زوال ہی زوال نظر آئے گا۔

عورت کو تعلیم دلانے کا صرف یہی مقصد ہرگز نہیں کہ مغربی ممالک کی طرح اسے پڑھا لکھا کر فیکٹریوں، کارخانوں، دفتروں اور نجی اداروں میں ملازمت کے لیے بھیجا جائے بلکہ اس کی تعلیم کا مقصد خود اس کی زندگی کو کامیاب بنانا ہے۔اسے ایسی شخصیت کا روپ دینا ہے کہ اس کی ذات سے منسلک ہر فرد اِس سے مستفید ہو سکے۔اسے ایسی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند کرنا ہے کہ وہ ایک اچھی ماں، اچھی بہن، سلیقہ شعار بیوی اور اطاعت گزار بیٹی بن سکے۔

غور طلب پہلو یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بھی کیا وہی نصاب کافی ہے جو لڑکوں کو پڑھایا جاتا ہے۔اس پہلو سے دیکھا جائے تو کچھ مضامین اور تعلیمی شعبے ایسے ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مشترک ہو سکتے ہیں لیکن کچھ مضامین اور شعبہ جات ایسے بھی ہیں جو زیادہ تر خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔پاکستانی معاشرے میں امورِ خانہ داری عام طور پر خواتین کی ذمہ داری سمجھے جاتے ہیں۔اس لیے سائنس، آرٹس، کامرس اور دیگر شعبہ جات سے متعلق مضامین کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے لیے امورِ خانہ داری اور گھریلو دستکاری جیسے مضامین بھی نصاب کا حصہ ہونے چاہییں۔مغربی تہذیب کی تقلید میں پڑھی لکھی خواتین کا مؤقف یہ ہوتا ہے کہ پڑھ لکھ کر بھی اگر چولھا ہی پھونکنا پڑے تو پھر تعلیم کا کیا فائدہ؟ یہ نظریہ غلط ہے کیوں کہ پڑھنے لکھنے کے بعد بھی ان کا اصل ٹھکانا گھر ہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ امورِ خانہ داری وہ اپنی درسگاہوں ہی سے سیکھ کر نکلیں۔لڑکیوں کے لیے تعلیمی اداروں میں پیشہ ورانہ تعلیم اور عملی تربیت دینے کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔

۷ سائنس کے کرشمے

خلیے کی گرہ کھولی ، جوہر کا جگر چیرا　　راکٹ کو خلاؤں میں بھیجا ہے سفیرانہ
اب ذوقِ تجسّس کا اک اور ہی عالم ہے　　گھومیں گے خلاؤں میں ہم خود ہی دلیرانہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ سننے اور بولنے کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اسے عقل وفہم اور علم وفضل بھی عطا کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات پر غور وفکر کرنے، اس کا مشاہدہ کرنے اور اس میں چھپے ہوئے خزانے دریافت کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس لیے انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے نہ صرف سورج، چاند، ستاروں، زمین، آسمان اور فضاؤں جیسے مظاہرِ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرتا چلا آ رہا ہے بلکہ کائنات کے تمام عناصر میں موجود وسائل کو دریافت کر کے اپنے استعمال میں لانے کے لیے نت نئی ایجادات کرتا چلا آ رہا ہے۔ سائنسی علوم کا بنیادی مقصد نئی نئی ایجادات اور دریافتوں کے ذریعے سے دنیا کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا اور زندگی گزارنے کے لیے نت نئے وسائل مہیا کرنا ہے۔ چوں کہ سائنس علم کا دوسرا نام ہے، اس لیے انسان عقل و علم کے ذریعے سے جو ایجادات کرتا ہے، وہ سائنسی ایجادات کہلاتی ہیں۔

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اس عہد میں حیرت انگیز ایجادات نے ہماری معاشرتی زندگی کے ہر پہلو میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ وہ چیزیں جن کا ذکر داستانوی اور افسانوی تھا، آج حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں۔ انسان سمندر کی تہ سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک اپنے قدم جما چکا ہے اور ساری دنیا سمٹ کر اس کے قدموں میں آ چکی ہے۔ کل تک غاروں میں رہنے والا انسان آج شان دار عمارتیں اور گھر تعمیر کر رہا ہے۔ ایسے گھر جن میں سائنسی ایجادات کی بدولت وہ تمام سہولیات میسّر ہیں جن کا کبھی تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف بجلی ہی کو دیکھیے، ہم کبھی روشنی کے لیے تیل سے جلنے والے چراغوں کے محتاج ہوا کرتے تھے، گرمی سے بچنے کے لیے دستی پنکھے تھامے ہوئے درختوں کی چھاؤں کا سہارا لیتے تھے۔ آج ایک بٹن دبائیں تو سارا گھر روشن ہو جاتا ہے۔ پنکھے، ائرکولر، ائرکنڈیشنر اپنا کام دکھانے لگتے ہیں اور ہم گرمی کی تپش سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کھانا پکانے کے لیے بجلی اور گیس کے چولھے، کھانے پینے کی اشیا محفوظ کرنے کے لیے ریفریجریٹر اور ڈیپ فریزر، کپڑے دھونے اور خشک کرنے کے لیے واشنگ اور ڈرائر مشینیں، کپڑے سینے کے لیے سلائی مشین اور پانی کی دستیابی کے لیے موٹر پمپ موجود ہیں۔ غرض ہمارے گھر سائنسی ایجادات سے اس طرح سج چکے ہیں کہ اگر پرانے دور کا کوئی شخص آ جائے تو اسے ہماری دنیا جنّت معلوم ہونے لگے۔ ہمیں اپنے گھروں سے باہر اور دوسرے شہروں یا ملکوں میں آنا جانا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے ذرائعِ نقل وحمل پر نظر ڈالیں تو ناقابلِ یقین حد تک انقلاب نظر آتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے ہمارے ذرائع آمدورفت کو گویا جادوئی بنا دیا ہے۔ فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ سالوں کے فاصلے دنوں میں اور دنوں کے فاصلے گھنٹوں، منٹوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ موٹر سائیکل، موٹر کار، گاڑی، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز جیسی ایجادات ہمیں وہ قوت عطا کر چکی ہیں کہ ہم فاصلوں کے ساتھ ساتھ وقت کو بھی محفوظ محسوس کرتے ہیں۔

جدید سائنسی ایجادات سے مواصلات کے نظام میں بھی اَن گِنت تبدیلیاں آئی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، موبائل فون، فیکس اور انٹرنیٹ، ایسی ایجادات ہیں جن کے سبب ہم ساری دنیا کو اپنے سامنے موجود پاتے ہیں۔ اب یہ ممکن ہو چکا ہے کہ ہم کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ ہزاروں میل دور بیٹھے کسی شخص کو براہِ راست دیکھ سکتے اور اس سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ای میل کے ذریعے سے چند سیکنڈوں میں ہزاروں کلومیٹر دور دوستوں کو پیغامات، مضامین، کہانیاں، اسباق اور اشعار وغیرہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں موبائل فون سے بھی کمپیوٹر کا کام لیا جا رہا ہے۔ طلبہ کمپیوٹر کو سامنے رکھ کر انٹرنیٹ سے کسی بھی تعلیمی ادارے، شعبۂ تعلیم اور کتاب وغیرہ کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سہولیات نے درس و تدریس کے نظام کو بہت مؤثر، علاج معالجے کی مستند معلومات کی فراہمی کو آسان اور معلوماتِ عامہ تک عام آدمی کی رسائی کو ممکن اور آسان بنا دیا ہے۔ قدیم دور کا انسان بے شمار توہمات کا شکار تھا۔ مختلف بیماریوں کے شکار انسان کو آسیب زدہ قرار دے دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ بڑا عجیب و غریب سلوک کیا جاتا تھا۔ ایک طرف بیماری، دوسری طرف تکلیف دہ طریقِ علاج اسے موت کی آغوش میں دھکیل دیتے تھے۔ سائنسی ترقی کی بدولت آج ہر مرض کی تشخیص ممکن ہو چکی ہے، نا قابلِ علاج مہلک امراض کا علاج ممکن بنا دیا گیا ہے اور جگر، دل، گردوں سمیت بے شمار انسانی اعضا کی پیوند کاری بڑی کامیابی سے کی جا رہی ہے۔

سائنس دانوں کے انسانیت پر بے شمار احسانات ہیں۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی ان کے احسانات سے بھری پڑی ہے۔ آج کا انسان بالوں کی تراش خراش؛ دانتوں کی صحت و صفائی، بینائی کے معاملات، تندرستی اور لباس سے لے کر جوتوں اور جرابوں تک سائنسی ایجادات کا مرہونِ منت ہے۔ اجتماعی لحاظ سے گھروں اور دیگر عمارتوں کی تعمیرات، اناج کی کھیت سے لے کر عام آدمی تک رسائی، بجلی، گیس اور صاف پانی کی فراہمی وغیرہ ہماری اجتماعی زندگی پر سائنسی ترقی کے احسانات کی مثالیں ہیں۔ اگرچہ سائنسی ترقی کے منفی اثرات کی مثالیں بھی اسلحہ سازی، بم، بارود کی بارش اور ایٹمی تابکاریوں کی صورت میں موجود ہیں لیکن اس میں سائنسی ترقی ہرگز قصوروار نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں قصور صرف منفی سوچ اور منفی ذہن کا ہے کہ جس کی وجہ سے سائنسی ایجادات کا منفی استعمال ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ سائنسی ترقی کی بدولت ہماری معیشت، صنعت، تجارت، زراعت، تعلیم اور تفریح جیسے تمام شعبہ جات نہایت تیز رفتاری سے ترقی کر رہے ہیں۔ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی میں اسی رفتار سے ترقی ہوتی رہی تو آنے والی نصف صدی میں یہ دنیا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائے بقول علامہ اقبالؒ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

۸ برداشت اور رواداری

سبھی کے دیپ سندر ہیں ہمارے کیا تمھارے کیا
اجالا ہر طرف ہے اِس کنارے اُس کنارے کیا

کسی منفی رجحان کے نتیجے میں اپنے سخت ردِّعمل پر قابو پا لینا برداشت ہے اور ردِّعمل کے طور پر منفی رویے کے بجائے مثبت حسنِ سلوک کو روا رکھنا، رواداری کہلاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اِس وقت جن منفی رجحانات سے دوچار ہے، ان میں عدمِ برداشت کو اوّلیت حاصل ہے۔ جس کے باعث ہمارے اندر رَواداری کا وصف مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں روزانہ ایسے بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو چھوٹی چھوٹی اور انتہائی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں دکھائی دیتے ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنا دیا جاتا ہے۔ محض اپنی جھوٹی انا اور ضد پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کا احترام پامال کیا جاتا ہے۔ عزتِ نفس مجروح کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ ہر آدمی اپنے نظریات اور اپنی سوچ کو سچا اور خود کو درست سمجھتا ہے۔ اور دوسرے کو سچ سے عاری گردانتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یقیناً تصادم کی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کا گلا تک کاٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم لوگ تھوڑی دیر کے لیے صبر و تحمل، برداشت اور رَواداری سے کام لیں تو بہت بڑے مالی و جانی نقصان سے بچا جا سکتا ہے۔ لیکن برداشت کا وصف لوگوں میں اُس وقت پیدا ہوگا جب وہ رواداری اور حسنِ سلوک کو اپنا شعار بنائیں گے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ نے ہمیشہ برداشت اور رواداری سے کام لیتے ہوئے ہمارے لیے ایسی بے شمار زندہ مثالیں قائم کی ہیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے رُشد و ہدایت کا ذریعہ بنی رہیں گی۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، پتھر برسائے گئے، طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا گیا مگر آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ نے ہمیشہ برداشت اور تحمّل سے کام لیا بلکہ فتحِ مکہ کے موقع پر تمام دشمنانِ اسلام کو معاف فرما دیا۔

اس وقت ہمارے ملک کے دو سنگین مسائل ہیں، جو لوگوں کو عدم برداشت اور تصادم کی طرف لے کے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ واریت ہے اور دوسرا مسئلہ طبقاتی امتیاز ہے۔ ان مسائل کی وجہ سے معاشرے کا امن و سکون غارت ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بہ حیثیتِ مسلمان جب ہمارا خالق و مالک ایک ہے، قرآن ایک ہے، رسول ایک ہے تو پھر ہمیں بھی ایک ہونا چاہیے۔ جب معاشرے میں ایک ساتھ رہتے ہوئے لوگ فرقہ واریت میں تقسیم ہو جائیں گے تو لامحالہ منافرت بڑھے گی۔ ایسے میں اگر رواداری اور برداشت کو بروئے کار لایا جائے تو ہم اختلافِ رائے کے باوجود لوگ امن و سکون کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔'' (آلِ عمران: آیت ۱۰۳)

اسلام تو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بھی حسنِ سلوک روا رکھنے کا درس دیتا ہے۔

عہدِ نبوی خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ میں ایک مرتبہ نجران سے مسیحی علما کا ایک وفد مدینے آیا اور مسجدِ نبوی خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ میں انھوں

نے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کچھ صحابہ نے تحفظات کا اظہار کیا لیکن رسولِ اکرم خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ نے ان مسیحیوں کو مسجدِ نبوی خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ میں عبادت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس واقعہ میں اسلام کی سچی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ یہ برداشت اور رواداری کی عظیم الشّان مثال ہے۔ لہٰذا اُسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہم سب کو فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر برداشت اور رواداری کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔

اسی طرح نسلی وطبقاتی امتیازات سے بھی خود کو دور رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے خاندانی اور قومی تفاخر کی بنا پر دوسرے لوگوں کو خود سے حقیر اور کم تر گردانتے ہیں۔ یہ رویہ بھی بسا اوقات جھگڑے اور تصادم کی فضا پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ جس سے لوگوں کا سکون غارت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ حالاں کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

''اور ہم نے تمھیں (مختلف) قومیں اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔'' (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ واضح کر دیا تھا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہوگی۔ ان واضح تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سب کو چاہیے کہ نسلی اور خاندانی تفاخر سے بالاتر ہو کر ہم آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں۔ یہ تبھی ممکن ہوگا جب ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے دوسروں کی باتوں کو برداشت کریں اور ان کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک سے پیش آئیں گے۔ اس رویے سے یقیناً معاشرے میں زندہ اور تابندہ روایات کو فروغ ملے گا۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے ترقی یافتہ اور مہذب معاشروں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ان میں جہاں اختلافِ رائے نظر آتا ہے وہاں برداشت اور رواداری کے نقوش واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے کامیابی اور ترقی کی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔

ہمیں بھی اپنی معاشرتی روایات کو حوصلہ مندی اور صبر و برداشت کے اصولوں پر قائم رکھنے کا عزم کرنا چاہیے تا کہ ہم آپس میں باہمی اخلاص کے ساتھ مثالی بھائی چارے کو فروغ دے سکیں اور اپنے وطن کے گلی کوچوں میں امن و آشتی کے چراغ روشن کر سکیں۔

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

۹ ٹریفک قوانین

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

سڑکوں پر چلنے والی مختلف قسم کی چھوٹی بڑی گاڑیوں کی آمد و رفت کو ٹریفک کہا جاتا ہے۔ جس طرح پوری کائنات کا نظام قانونِ قدرت کے تحت چل رہا ہے مثلاً سورج اور چاند ستاروں کا طلوع و غروب، موسموں کی آمد و رفت، فصلوں کا پکنا وغیرہ سب ایک قانون کے تابع ہیں، اسی طرح سڑکوں پر ٹریفک کی آمد و رفت کے لیے بھی انسانوں نے قوانین ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ سائنسی ترقی کی بدولت جہاں دیگر ایجادات نے عقلِ انسانی کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے وہاں ذرائعِ نقل و حرکت بھی سائنس ہی کے مرہونِ منت ہیں جن کی بدولت لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی آتے اور جاتے ہیں۔ مہینوں کا سفر دنوں میں اور دنوں کا گھنٹوں میں طے ہونے لگا ہے۔

جدید دور کی سفری اور باربرداری کی اِن سہولتوں کا ایک نقصان دہ پہلو بھی ہے۔ سڑکوں پر موٹر سائیکلوں، کاروں، بسوں، رکشوں، ویگنوں اور ٹرکوں وغیرہ کی تعداد میں اضافے کے باعث ٹریفک کے بے شمار مسائل پیدا ہونے لگے ہیں۔ اگرچہ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے قوانین بھی تشکیل دیے گئے ہیں مگر بدقسمتی سے ٹریفک کے قوانین پر عمل کرنے کے شعور کا فقدان نظر آتا ہے۔ قانونی پیچیدگیوں سے قطع نظر، اگر ہم اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں تو ٹریفک قوانین کی پابندی کرنا نہایت ضروری ہے۔ انھیں نظرانداز کرنے سے معاشرتی صورتِ حال بگڑنے کے علاوہ قیمتی جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں۔

عام طور پر ٹریفک قوانین کی عمل داری میں رکاوٹ کی وجہ جہالت اور ناسمجھی ہوتی ہے۔ اکثر ڈرائیور حضرات ان پڑھ ہوتے ہیں جنھیں ٹریفک قوانین تو کیا، ٹریفک کے اشاروں تک کی صحیح سوجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات لوگ کم عمری میں لائسنس کے بغیر گاڑیاں چلانے لگتے ہیں۔ پھر پیسے کے لالچ میں گاڑیوں کے مالکان ایک ہی ڈرائیور کو مسلسل کئی کئی گھنٹوں کی ڈیوٹی سونپ دیتے ہیں۔ جہاں دو ڈرائیوروں کی ضرورت ہو وہاں ایک ہی ڈرائیور سے کام چلایا جاتا ہے۔ نتیجۃً تیز رفتاری، تھکاوٹ یا نیند آجانے کے باعث چھوٹے بڑے حادثات رُونما ہو جاتے ہیں۔

من حیث القوم ہمارا مزاج بھی عجیب ہے۔ موٹر وے پر ہوتے ہیں تو ہمارا رویّہ دنیا کی ہر مہذّب قوم جیسا ہوتا ہے اور جونہی جی ٹی روڈ پر آتے ہیں تو تہذیب سے ناتا ٹوٹ جاتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ٹریفک قوانین کو پسِ پشت ڈالنا اور ان کی خلاف ورزی کرنا نوجوان نسل کا فیشن بن گیا ہے۔ موٹر سائیکلوں پر ون وہیلنگ کرنا یا ایک ہی موٹر سائیکل پر اکٹھے چار پانچ نوجوانوں کا بیٹھ کر تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا نہایت خطرناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن اخبارات ہولناک حادثات کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں

اور ٹیلی ویژن پر ان حادثات کے مناظر دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑی بڑی بسیں جو لمبے روٹس پر چلتی ہیں ان کے ڈرائیو رتیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگلی گاڑی سے آگے نکلنے کی کوشش میں اکثر اوقات حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ سرکاری محکمہ جات کی طرف سے سڑکوں پر جگہ جگہ مقررہ حدِ رفتار کے بورڈ آویزاں ہوتے ہیں مگر قابلِ افسوس امر ہے کہ اکثر اوقات ان اشاروں اور تحریروں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذرا سی غلطی گھروں کے گھر اجاڑ دیتی ہے۔

سڑکوں کا بروقت مرمت نہ ہونا، غیر معیاری ہونا اور ان پر غیر قانونی سپیڈ بریکر بنانا بھی حادثات کے اسباب میں شامل ہے۔ اسی طرح سڑکوں پر ناکارہ گاڑیوں کا چلنا بھی بہت سارے حادثات کا باعث بنتا ہے۔ ٹریفک کے قوانین وضوابط میں یہ بات بھی شامل ہے کہ سڑکوں پر ہر اعتبار سے کارآمد گاڑیاں چلائی جائیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نوعیت کی کھٹارا گاڑیوں کو سڑک پر لانا ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔ قوانین سے لاپروائی کے باعث اکثر اوقات سڑکوں پر ٹریفک بے ہنگم اور بے قابو ہو جاتی ہے۔ منزل تک جلد پہنچنے کی دُھن میں ڈرائیور حضرات پہلے سے پھنسی ہوئی ٹریفک میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اس اقدام سے ٹریفک مزید جام ہو جائے گی۔ اُن کے قِطار توڑنے سے آگے پیچھے آنے والی گاڑیاں ایک دوسرے میں پھنس جاتی ہیں اور لوگوں کو کئی کئی گھنٹوں تک ذہنی وجسمانی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال سے عدم برداشت، غصّہ، چڑچڑاپن، ڈپریشن اور اعصابی تناؤ جیسے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہارن کا بے جا استعمال اور گاڑیوں کے خراب سائیلنسر بھی اس نوع کی بیماریوں کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔

آج کل ڈرائیونگ کے دوران میں موبائل فون کا استعمال عام رواج بن گیا ہے جو سراسر غیر قانونی ہے۔ اس سے نہ صرف ٹریفک کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ خطرناک حادثات بھی پیش آ رہے ہیں۔ اسی طرح بے شمار لوگ ڈرائیونگ کے دوران میں سیٹ بیلٹ باندھنا گوارا نہیں کرتے۔ رات کے وقت ٹرک اور ٹریکٹر ٹرالیاں سڑکوں پر چلتی ہیں تو ان پر لدا ہوا سامان مثلاً لکڑیاں، گنا، لوہے کے گاڈر، ٹی آئرن وغیرہ دائیں بائیں سے باہر نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور سامنے سے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور لائٹس کی وجہ سے صحیح طرح سے دیکھ نہیں پاتا جس کے باعث حادثات پیش آ جاتے ہیں۔ رات کے وقت اکثر ڈرائیور اپنی گاڑی کی لائٹس کو مدھم نہیں رکھتے۔ یہ عمل بھی خلافِ قانون ہے اور حادثات کا باعث بھی۔

ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی روکنے کے لیے نہ صرف ٹریفک پولیس ذمہ دار ہے بلکہ عوام النّاس میں بھی احساسِ ذمہ داری پیدا ہونا چاہیے۔ پیدل چلنے والے سڑک پار کرتے وقت زیبرا کراسنگ کا استعمال کریں، سائیکل اور موٹر سائیکل والے سڑک کے بائیں جانب چلیں، حدِ رفتار کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور ون وہیلنگ جیسے جرم کا کسی صورت بھی ارتکاب نہ کریں۔ لائٹ ٹرانسپورٹ وہیکل (LTV) اور ہیوی ٹرانسپورٹ وہیکل (HTV) استعمال کرنے والے ڈرائیور نہ صرف اپنی اپنی لین میں گاڑی چلائیں بلکہ مجوزہ رفتار کا بھی خیال رکھیں اور اوورلوڈنگ ہرگز نہ کریں۔ سائیکل، موٹر سائیکل، کار اور تمام چھوٹی بڑی گاڑیوں کے ڈرائیور ٹریفک کے اشاروں کا خاص خیال

رکھیں، سرخ بتی (سگنل) روشن ہوتو اپنی اپنی لین میں رہتے ہوئے رک جائیں، گاڑیاں بے ہنگم طریقے سے کھڑی نہ کریں، پیلی بتی کا مطلب ہے چلنے کے لیے تیار ہوجائیں جب کہ سبز بتی کا اشارہ بتاتا ہے کہ اب آپ گاڑی آگے بڑھا سکتے ہیں۔

بغیر لائسنس اور بیماری کی حالت میں گاڑی ہرگز نہ چلائیں۔ والدین کم عمر بچوں کو کسی صورت موٹر سائیکل یا گاڑی وغیرہ نہ چلانے دیں۔ عوام اور ٹریفک پولیس دونوں طرف کا یہ باہمی تعاون ہی صورتِ حال کی بہتری کا ضامن بن سکتا ہے۔ ٹریفک پولیس کو مناسب تربیت اور جدید ٹیکنالوجی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس پیشے کو ہر طرح کے حرص و ہوس اور کرپشن سے پاک رکھا جائے۔ حکومتی سطح پر عوام کے لیے مختلف سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کی جائیں اور عوام کو ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے خطرات و حادثات سے آگاہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مناسب سزا دی جائے۔ جدید ذرائعِ اطلاعات و نشریات مثلاً ٹی۔وی، ریڈیو، اخبارات و رسائل اور انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے سے عوام کو ٹریفک قوانین کا شعور دینا چاہیے تاکہ لوگ خود معاشرتی اور ملکی سطح پر جان و مال کے تحفّظ کو یقینی بنا سکیں۔

۱۰ کسبِ حلال کی فضیلت

کسب اور حلال دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ کسب کے معنی ہیں کمائی، تحصیل، حصول جب کہ حلال کے معنی ہیں جائز، روا، درست، طیّب، مباح وغیرہ۔ گویا کسبِ حلال سے مراد جائز کمائی کرنا اور رزقِ حلال کمانا ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! اُن (چیزوں) میں سے کھاؤ جو زمین میں حلال (اور) پاکیزہ ہیں اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔'' (سورۃ البقرہ: آیت ۱۶۸)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے سے بندوں کو حلال و طیب کھانے کا حکم صادر فرمایا ہے اور حرام چیزیں کھانے سے منع فرمایا ہے۔ حرام اشیا انسان کے اخلاق اور کردار کو بگاڑ دیتی ہیں جب کہ حلال، جائز اور پاکیزہ رزق سے دل روشن ہوتے ہیں۔ حلال رزق محنت کر کے کمایا جاتا ہے۔ اسی لیے محنت کرنے والے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسا رزق انسان کو نیک راہ پہ چلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جو لوگ رزقِ حلال کماتے ہیں، ان کا اخلاق اور کردار اتنا پاک صاف ہوجاتا ہے کہ ہر برے کام سے انھیں گھِن آنے لگتی ہے۔ وہ بری صحبت سے اور برے افعال سے بچتے ہیں اور ایسی چیزوں کے کھانے پینے کی طرف قطعاً نہیں جاتے جنھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ برکت ڈال دیتا ہے۔ ان کی اولادیں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی دنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت بھی۔ ان کے مقابلے میں حرام رزق کمانے والے اور حرام خوری کرنے والے اپنی دنیا اور آخرت

برباد کر لیتے ہیں۔ ملاوٹ، خیانت، بددیانتی اور دھوکا دہی رزقِ حرام کے ذرائع ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ حرام خوری صرف یہ نہیں کہ وہ چیزیں کھانا پینا جنھیں دین میں حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ حرام کی دولت سے خرید کر کھایا گیا حلال جانور کا گوشت بھی سور کے گوشت جیسا اور حرام کی رقم سے خریدا گیا پاک صاف مشروب بھی شراب کی طرح حرام ہوتا ہے۔ حرام خوری سے اس فانی دنیا میں عارضی لذّت تو حاصل ہوتی ہے لیکن حرام خور اپنے اخلاق و کردار کو داؤ پر لگا لیتے ہیں۔ بدنامی ان کا مقدّر بن جاتی ہے۔ ان کا خون سفید اور دل رزقِ حرام کے سبب سیاہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ ایک غلّے کے ڈھیر کے قریب سے گزرے تو آپ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے اس کے اندر اپنا ہاتھ داخل کر دیا، آپ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی انگلیاں تر ہو گئیں تو آپ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

> ''غلّے والے! یہ کیا معاملہ ہے؟'' اس نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ، بارش سے بھیگ گیا ہے۔'' آپ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''اسے اوپر کیوں نہیں کر دیا تاکہ لوگ دیکھ سکیں۔'' پھر آپ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: جو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (سنن ترمذی: ۱۳۱۵)

غور کیجیے! جسے رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ فرما دیں کہ ''ہم میں سے نہیں ہے'' اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ ایسے بدنصیب کی دنیا کیا ہوگی اور انجام کیا ہوگا؟

جس کو برا حضورؐ نے سمجھا برا ہے وہ
اچھا ہے وہ حضورؐ ہی اچھا کہیں جسے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اسے مسجودِ ملائک ٹھہرایا ہے۔ زمین کی تہ سے لے کر آسمانوں کی بلندیاں تک اس کے سامنے مسخر ہیں۔ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتا ہے۔ وہ ستاروں پہ کمندیں ڈال سکتا ہے۔ وہ معراجِ مصطفیٰ خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ سے خبر پا چکا ہے کہ آسمان کی وسعتیں اس کی زد میں ہیں۔ وہ جبر کو قدر میں بدل سکتا ہے لیکن رزقِ حرام کا حصول ایسا رذیل، گھٹیا، سطحی اور بدانجام فعل ہے جو اس کی بلندیوں کو پستیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ حرام رزق کمانے والے کو آسمان کی بلندیوں سے پٹخ کر زمین کی پستیوں میں دبا دیتا ہے۔ اسی لیے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تاکید کی ہے:

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دیانت داری اور محنت سے روزگار کمانے والا شخص اپنا بھی بھلا کرتا ہے اور معاشرے کا بھی۔ ہماری روزمرہ کی اشیائے خورونوش اگر خالص ہوں تو یہ ہر شخص کے مفاد میں ہوگا۔ دودھ کی مثال ہی لیجیے، خالص دودھ ہر بچے، بڑے اور بوڑھے کی بنیادی غذا ہے۔ آٹا، چینی،

دال اور گھی کی بھی یہی مثال ہے۔اسی طرح اپنے منصب سے انصاف کرنا بھی درحقیقت معاشرے اور اس کے افراد کو مفاد پہنچانا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ حلال کمانے والا ہمیشہ دوسروں کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے تو بالکل درست ہے۔

رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کا فرمان ہے:

''تم میں سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع دے۔'' (کنز العمال:۷۴۴۱۴)

رزقِ حلال کے حصول کے لیے کوئی بھی جائز پیشہ اپنایا جا سکتا ہے۔تعمیر و ترقی کا کوئی بھی محنت طلب کام کیا جا سکتا ہے۔محنت مزدوری، کھیتی باڑی، گلّہ بانی، ملازمت، تجارت اور عملی فنون یعنی ہنرمندی کا کوئی بھی کام (جس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو) کیا جا سکتا ہے۔انبیائے کرام میں سے زراعت حضرت آدم علیہ السّلام کا پیشہ تھا، لباس تیار کرنا حضرت ادریس علیہ السّلام کا پیشہ، بکریوں کا کاروبار کرنا حضرت شعیب علیہ السّلام کا پیشہ، کشتی تیار کرنا اور بڑھئی کا کام کرنا حضرت نوح علیہ السّلام کا پیشہ، بزازی (کپڑا بیچنا) حضرت زکریا علیہ السّلام اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا پیشہ، تیر بنانا، حضرت صالح علیہ السّلام کا پیشہ، جوتے سینا اور ان کی تجارت کرنا، حضرت داؤد علیہ السلام کا پیشہ لوہے کی زرہیں بنانا تھا، جب کہ اعلانِ نبوّت سے قبل حضور اکرم خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ بھی تجارت سے منسلک تھے۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بھی محنت کر کے روزگار کمانے میں ذرا تامل نہ فرمایا۔ان کی اکثریت تجارت سے منسلک تھی۔

انبیائے برحق، رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے کسبِ حلال کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کیے اور محنت کو عار سمجھنے کے بجائے اسے اپنے لیے باعثِ عظمت جانا۔ان کی زندگیاں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ کسی بھی جائز پیشے کو کم تر سمجھیں اور اس پیشے سے منسلک کسی بھی شخص کو حقیر جانیں۔یقیناً محنت کرنے والا اللہ اور اس کے رسول خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کی تعلیمات کے مطابق نہایت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے۔دنیا میں وہی لوگ اور وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جن کا شعار محنت ہے۔آج کے نوجوان اگر کسبِ حلال کی غرض و غایت اور اس کی اصل روح و فضیلت کو سمجھتے ہوئے محنت کو اپنا شعار بنالیں تو بے روزگاری کا کبھی شکوہ نہ کریں۔ایسا شعار کسی بھی معاشرے کو خوش حال بنا دیتا ہے۔بقول مولانا حالی:

وہی لوگ پاتے ہیں عزّت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ
جو محنت نہ ہوتی تجارت نہ ہوتی
کسی قوم کی شان و شوکت نہ ہوتی
جو ہاتھوں سے اپنا کمایا وہ اچھّا
جو ہو اپنی محنت کا پیسا وہ اچھّا

۱۱ قدرتی آفات

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایّام ہیں!

قدرتی آفات کا تعلق انسان یا اس سے وابستہ اشیا اور اثاثہ جات کی تباہ کاریوں سے ہے۔ ایسے قدرتی عوامل جو انسان کے لیے جانی اور مالی نقصان کا سبب بنیں، انھیں قدرتی آفات کہتے ہیں۔ ان آفات میں زلزلہ، سیلاب، ڈینگی وائرس، کرونا وائرس، پولیو، قحط سالی، آتش فشانی، زمین کا سرکنا، گرد باد اور جنگل کی آگ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے زلزلہ، سیلاب، کرونا اور ڈینگی وائرس ایسی قدرتی آفات ہیں جن کا دنیا کے دیگر ممالک طرح ہمارے پیارے وطن پاکستان کو بھی اکثر و بیشتر سامنا رہا ہے۔ ان تمام آفات میں بالخصوص زلزلہ ایک ایسی قدرتی آفت ہے جو اچانک وقوع پذیر ہوتی ہے اور بعض اوقات انتہائی تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ زمین کی اچانک حرکت، لرزش یا تھرتھراہٹ کو زلزلہ کہتے ہیں۔ زمین کے اندر کے مادے جب گرم ہو کر پھیلتے ہیں تو زمین پھٹتی ہے اور زور زور سے ہلنا اور کانپنا شروع کر دیتی ہے۔ زمین کا کانپنا کبھی تو اس قدر کم ہوتا ہے کہ زمین کے مکینوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی اور کبھی یہ اس زور سے کانپتی ہے کہ عمارتیں لرز کر رہ جاتی ہیں، گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے زور زور سے بجنے لگتے ہیں، شیشے ٹوٹ جاتے ہیں اور شدید زلزلے کی صورت میں انسانی بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں، پل ٹوٹ جاتے ہیں، سڑکیں، ریلوے لائینیں، پائپ لائینیں اکھڑ جاتی ہیں اور مواصلاتی نظام وغیرہ پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسانی ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ ان کی جائیدادیں بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ قدرتی آفت انسانوں کی بڑی بربادی کے ساتھ ساتھ درختوں، فصلوں، جانوروں اور دیگر انسانی وسائل کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے۔

زلزلہ آیا اور آ کر ہو گیا رخصت مگر
وقت کے رخ پر تباہی کی عبارت لکھ گیا

اچانک رونما ہونے والا شدید زلزلہ کئی دوسری آفات کا بھی پیش خیمہ بنتا ہے۔ مثال کے طور پر زیرِ زمین لرزش اور عدم مطابقت کی وجہ سے آنے والا زلزلہ آتش فشاں پہاڑ سے لاوا اگلنے کا سبب بھی بن سکتا ہے، اس کی وجہ سے سونامی کے خطرات منڈلانے لگتے ہیں، پہاڑوں سے چٹانیں اور پتھر ٹوٹ کر گرتے ہیں جو قریبی آبادیوں میں مالی اور جانی نقصان کا باعث بنتے ہیں، گلیشیئرز سے برف کے تودے دریاؤں میں گر کر سیلاب کا سبب بنتے ہیں اور زمین کا سرکنا کئی طرح سے وقوع پذیر ہونے لگتا ہے۔ یوں زلزلے کے نقصانات تو اپنی جگہ مگر اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی آفات کے نقصانات صورتِ حال کو مزید سنگین بنا دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اب تک کئی چھوٹے بڑے زلزلے آتے رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے شدید

ترین زلزلے سے پورا شہر برباد ہو گیا تھا اور تقریباً پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ۸ / اکتوبر ۲۰۰۵ء میں پاکستان کے شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں آنے والا زلزلہ بھی انتہائی تباہ کن ثابت ہوا۔ اس زلزلے نے جو قیامت برپا کی، اس کا تصوُّر کر کے آج بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اس زلزلے نے مظفر آباد، بالاکوٹ، باغ، مانسہرہ، راولاکوٹ اور گردونواح کے علاقوں سمیت ایک وسیع وعریض سرزمین کو تباہ و برباد کر دیا، پہاڑ اپنی جگہ سے سَرک گئے، چٹانیں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور ندی نالوں کے رخ بدل گئے۔ اس زلزلے کے نتیجے میں تقریباً اسّی ہزار (۸۰۰۰۰) انسانی جانوں کا ضیاع ہوا، لاکھوں لوگ معذور ہو گئے، بے شمار تعلیمی ادارے، دفاتر، نجی املاک، مال مویشی، گھر اور جائیدادیں پہاڑوں کے نیچے دھنس گئیں۔ اکتوبر ۲۰۱۵ء میں بھی شمالی پنجاب اور خیبر پختون خوا میں شدید نوعیت کا زلزلہ آیا۔ ریکٹر سکیل پر اس کی شدّت ۷.۳ تھی۔ اس زلزلے نے بھی شمالی علاقوں میں بڑی تباہی مچائی، سیکڑوں لوگ ہلاک ہوئے اور ہزاروں بری طرح متاثر ہوئے۔

زلزلے کی طرح سیلاب بھی ایک خطرناک قدرتی آفت ہے۔ بارش کے باعث جب دریاؤں میں پانی کا بہاؤ اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بارشوں کے علاوہ ڈیم کا ٹوٹنا اور پہاڑوں پر برف کا پگھلنا بھی سیلاب کا سبب بن سکتا ہے۔ دریاؤں کا پانی جب اپنی حدیں پھلانگتا ہوا شدید بہاؤ کے ساتھ میدانی علاقوں میں آتا ہے تو انسان، جانور، عمارات اور کھڑی فصلیں اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔ یہ بپھرا ہوا سیلاب ایک طرف انفرادی سطح پر مالی اور جانی نقصان کے سانحے کی داستانیں چھوڑ جاتا ہے تو دوسری طرف ملک وقوم کی معیشت کو تباہ حال بنا دیتا ہے:

بستی کے گھروں کو کیا دیکھے، بنیاد کی حرمت کیا جانے
سیلاب کا شکوہ کون کرے، سیلاب تو اندھا پانی ہے

پاکستان جیسا ترقی پذیر ملک بوجوہ اب تک بارشوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کافی نقصان اٹھا چکا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سیلابی ریلوں کی تباہ کاریوں کی تحریروں اور تصویروں سے بھرا پڑا ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو سیلاب کے شدید ریلوں کی زد میں آ کر لقمۂ اجل بنے اور زخمی ہوئے۔ کتنے ہی مویشی ہلاک ہوئے، کتنی ہی کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں، کتنی ہی عمارتیں زمین بوس ہوئیں، کتنی ہی زیرِ کاشت زمینیں دریا برد ہوئیں اور اس سبب کتنے ہی وبائی امراض ہیں کہ جو انسانوں اور مویشیوں کی بیماری اور موت کا باعث بنے۔ بجلی کی بندش، سہولیاتِ زندگی کی عدم دستیابی اور مہنگائی بھی سیلاب ہی کا ردِعمل ہے۔ حکومتِ پاکستان کو تقریباً ہر سال ہی اس آفت سے نمٹنے اور سدِ باب کے لیے اربوں روپے کے وسائل استعمال کرنے پڑتے ہیں لیکن ۲۰۲۲ء میں آنے والے سیلاب نے تباہی و بربادی کی نئی تاریخ رقم کر دی۔ اس سال حکومت نے زیادہ بارشوں کے باعث پاکستان کے ۷۲ اضلاع کو آفت زدہ قرار دیا۔ پاکستان کی ایجنسی برائے انسدادِ قدرتی آفات کے مطابق بارشوں اور سیلاب کے باعث ۵۰۰۰ کلومیٹر سے زائد سڑکیں تباہ ہوئیں، ۱۲۰۰ سے زائد افراد ہلاک اور ۶۰۰۰ سے زائد زخمی ہوئے جب کہ تقریباً ۷۵۰۰۰ مویشی بھی موت کے منھ میں چلے گئے۔

سیلاب سے متعلق مناسب آگاہی اور انتباہی نظام، نکاسیِ آب کا انتظام اور زائد پانی ذخیرہ کرنے کے لیے چھوٹے بڑے ڈیمز کی تعمیر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ سیلاب کے دنوں میں حکومت اور عوام کے باہمی اشتراک سے وبائی امراض کی روک تھام اور دیگر انسانی ساختہ وجوہات کا تدارک کیا جاسکتا ہے اور یہ اس خطرناک آفت سے بچاؤ کے لیے ناگزیر ہے۔

گزشتہ تین چار عشروں سے پاکستان کے طول وعرض میں ڈینگی بخار بھی ایک قدرتی آفت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ڈینگی بُخار مادہ مچھر (ایڈیز) کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ یہ مچھر منطقہ حارہ اور ذیلی منطقہ حارہ کے علاقوں میں پایا جاتا ہے جن میں پاکستان سمیت جنوب مشرقی ایشیا کے اور بھی بہت سے ممالک شامل ہیں۔ پاکستان میں اس وبا سے شروع شروع میں بہت سی ہلاکتیں ہوئیں لیکن بر وقت حکومتی اقدامات سے بڑھتی ہوئی ہلاکتوں پر تو قابو پا لیا گیا لیکن اس مچھر کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہو سکا۔ ڈینگی مچھر کی افزائش کا بڑا سبب عوام کی عدم احتیاط ہے۔ حکومت کی منظّم کوششوں سے عوام کی اکثریت کو شعور حاصل ہو چکا ہے کہ چھتوں، کھلے میدانوں، کیاریوں، گملوں، بیکار ٹائروں اور کھلے برتنوں سمیت کسی بھی جگہ جمع شدہ کھڑا پانی مچھر کی افزائش کا ذریعہ ہے۔ اس لیے ہم سب پر لازم ہے کہ اس موذی وبا سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن احتیاطی تدابیر اپنائیں، کوشش کی جائے کہ کہیں پانی کھڑا نہ ہو، مچھر کش ذرائع استعمال کیے جائیں، سوتے جاگتے بازو، ٹخنے اور پاؤں ننگے نہ ہوں اور نکاسیِ آب کا مستقل انتظام کیا جائے۔ ڈینگی بُخار میں مبتلا ہونے کی صورت میں مریض کو چاہیے کہ فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرے اور ٹونے ٹوٹکوں سے دور رہے۔

ڈینگی بخار کی وبا کے علاوہ ۲۰۱۹ء میں کرونا وائرس سے پھیلنے والی وبا جسے COVID-19 نام دیا گیا ایک ایسی قدرت آفت ہے جس نے تھوڑے ہی عرصے میں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور لاکھوں افراد اس کی زد میں آ کر لقمۂ اجل بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ حکومتی اور عوامی سطح پر احتیاطی تدابیر کو اپنانے اور بروقت ویکسینیشن کے سبب پاکستان اس مہلک وبا کے زیادہ نقصانات سے محفوظ رہا۔ کرونا وائرس مختلف اشکال میں اب بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں پنپ رہا ہے اس لیے اب بھی اس سے خبردار رہنے اور تمام احتیاطی تدابیر کو جاری رکھنے کی از حد ضرورت ہے۔

۱۲ احساسِ تحفّظ

احساسِ تحفّظ ہر ذی شعور انسان کا بنیادی حق ہے اور اس تحفّظ کی فراہمی ہر اُس شخص کا اولیں فریضہ ہے، جو مذہبی، معاشرتی، اخلاقی یا قانونی طور پر اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہو۔ ایسا معاشرہ جہاں لوگ ہر حوالے سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوں، خوش حال معاشرہ کہلاتا ہے اور معاشرتی خوش حالی اُسی وقت ممکن ہوتی ہے جب ہر فرد یہ محسوس کرے کہ اس کی بقا، اس کے معاشرے اور قوم و ملّت سے وابستگی ہی میں مضمر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر فرد کا اس بات پر بھی پختہ یقین ہونا چاہیے کہ معاشرے کی تعمیر، تشکیل اور تقدیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔

بچپن، جوانی اور بڑھاپا، زندگی کے وہ مراحل ہیں جن سے ہر شخص گزرتا ہے۔ ان تمام مراحل کے تقاضوں کو کَمَاحَقُّہٗ نبھانے والے افراد بہترین اور خوش حال معاشرے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ زندگی کے ان مراحل میں سب سے اہم مرحلہ بچپن کا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

کتاب زندگی کا سب سے پہلا باب ہے بچپن
ہماری آنے والی زندگی کا خواب ہے بچپن
اسی مرکز سے رخ تبدیل ہوتا ہے نگاہوں کا
یہیں سے سلسلہ چلتا ہے مستقبل کی راہوں کا

بچپن کے اس مرحلے میں ہر شخص جسمانی، ذہنی، سماجی اور جذباتی حوالوں سے نشوونما پاتا ہے۔ زندگی کا یہ مرحلہ بارہ سے سولہ سال تک کی عمر میں انتہائی حسّاس نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور عنفوانِ شباب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس عمر میں بچے بلوغت کے مرحلے میں قدم رکھتے ہیں۔ جسمانی ساخت میں تبدیلی عجیب سا ذہنی خلفشار پیدا کرتی ہے۔ خوشی، غم، غصّہ اور برداشت جیسے جذبات عجیب ذہنی کیفیات سے دوچار کرتے ہیں۔ بچے کے تعلقات گھر اور سکول سے نکل کر عام معاشرے تک پھیل جاتے ہیں۔ اس لیے یہ دور بچے کے اخلاق، کردار، ذہنی پختگی اور بہترین شخصیت کی بنیاد کے لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ بچے نت نئے دوست بناتے ہیں اور ان کے اوقاتِ کار نئے رخ اختیار کرتے ہیں۔ یہ نئے دوست اور نئی صحبتیں اگر:

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر ، باز با باز

کی طرح محدود رہیں تو صورتِ حال تسلی بخش کہی جا سکتی ہے۔ اگر اس کے برعکس ہوں تو ان کا انجام یقیناً تباہ کن ہوگا۔ ہر جنس کی اپنی ایک فطرت ہے۔ اس لیے کسی بھی صورت میں غیر فطری ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

بچوں کو دوستی کے حوالے سے بہترین اور محفوظ ترین ماحول کی یقینی فراہمی والدین کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ وہ جس طرح

اپنے بچوں کو پولیو، ٹی بی، ٹائیفائیڈ، خسرہ، ڈینگی بخار اور کرونا وائرس جیسی مہلک بیماریوں سے بچاؤ کے لیے ان کی ویکسینیشن کراتے اور دیگر حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہیں، کسی بھی دہشت گردی جیسی ہنگامی صورتِ حال سے بچنے کے لیے بچوں کے اردگرد کے ماحول پر کڑی نظر رکھتے ہیں، اسی طرح انھیں چاہیے کہ بچوں کے تمام تفریحی مشاغل کو مثبت اور تعمیری بنائیں۔ بچوں کی زندگی میں نظم وضبط لائیں اور بچوں کی دوستیوں کے معاملے کو موزونیت سے مشروط رکھیں۔ بچے اپنے والدین کو ہر طرح سے اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ جھوٹ، فراڈ، چوری، بہتان تراشی، سگریٹ نوشی، دنگا فساد جیسی معاشرتی برائیوں کے منفی اثرات گھر اور اردگرد کے ماحول سے بچوں پر براہِ راست اثر انداز ہیں۔ لہٰذا ماں باپ، بہن بھائی، دادا دادی اور نانا نانی ایسے افراد ہیں جو گھر کا ماحول سازگار بنا سکتے ہیں۔ یہ تمام افراد اپنا رول ماڈل پیش کر کے بچوں کے غلط رویّوں کی غیر محسوس طریقے سے نہ صرف اصلاح کر سکتے ہیں بلکہ انھیں ہر قسم کی غلط صحبت سے بچا کر محفوظ اور فعال فرد بنا سکتے ہیں۔

معاشرے کے اچھے برے لوگوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ایک بیٹی کو چاہیے کہ وہ اپنی ماں کو اپنی بہترین دوست سمجھے۔ اپنے روزمرّہ معمولات اور مسائل کے بارے میں اپنی ماں کو خبردار رکھے اور دوستانہ ماحول میں اس سے ہر طرح کی رہنمائی طلب کرے۔ ماں بھی اپنی بیٹی کو اچھے انداز اور حکمت سے بتائے کہ اپنی ذات کی کیسے حفاظت کرتے ہیں اور کس طرح اپنے وجود کو اغیار سے دور رکھتے ہیں۔ ماں کو چاہیے کہ وہ اپنی بیٹی میں اچھے برے لوگوں میں تمیز رکھنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اسی طرح بیٹے کو چاہیے کہ وہ اپنے والد کا دوست بن جائے اور یقین رکھے کہ اس کے ساتھ اس کے والد صاحب سے زیادہ اچھی دوستی نبھانے والا اور کوئی نہیں ہے۔ والد کو بھی چاہیے کہ وہ اپنا رویّہ اپنے بیٹے کے ساتھ دوستانہ رکھے۔ بچے کی صحبت کا دھیان رکھے اور اسے بتائے کہ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ باپ اس امر کو بہر صورت یقینی بنائے کہ اس کا بیٹا کسی بدکماش، اوباش یا مشکوک شخص سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا۔ بچے معصوم اور کورے کاغذ کے مانند ہوتے ہیں جن پر والدین ہر طرح کی تحریر لکھ سکتے ہیں۔ بچوں کی تمام حرکات وسکنات پر والدین کی کڑی نظر انھیں بے راہ روی سے بچا سکتی ہے۔ بچوں کے کھیل کود، لباس، نہانا دھونا، سونا جاگنا، کھانا پینا اور پہننا اوران سب پر مکمل توجہ رکھنا بچوں کے محفوظ اور خوش حال مستقبل کی بنیادیں ہیں۔ فہم وفراست رکھنے والے والدین اپنے بچوں کے معمولات، گفت وشنید اور چال ڈھال سے ان کے اخلاق وکردار کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور صحابیات رضی اللہ عنھن کے روشن اخلاق وکردار کی مثالیں دے کر بچوں کی تربیت کرنی چاہیے۔ انھیں دینی اور سماجی حوالوں سے کارہائے نمایاں انجام دینے والے قوم کے سپوتوں کی داستانیں سنائی جائیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں بچوں کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو جو امور اپنانے کا حکم دیا ہے اور امہات المومنین رضی اللہ عنھن نے ان کا عملی ثبوت پیش کر کے دکھایا ہے، ہر ماں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے اور اپنی بیٹی

کے لیے مثالی نمونہ بننا چاہیے۔ایک والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال بن کر اپنے بیٹے کی حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسی تربیت کرے اور بیٹا اتنا معتبر، مؤدب اور مکمل انسان ثابت ہو کہ اپنے باپ کے حکم پر اپنے مال وجان سمیت سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

بچوں کا سماجی اور اخلاقی شعور بہتر بنایا جائے۔انھیں قوم وملّت کے نوجوانوں کی بہادری کے ایسے قصّے سنائے جائیں جو انھیں بااعتماد، مضبوط اور بہادر بنائیں۔ایسا بہادر کہ اگر کوئی غلط کار انھیں ورغلانے یا اغوا کرنے کی کوشش کرے تو یہ ننھے سپاہی اسے منھ توڑ جواب دے سکیں۔بچوں کے تفریحی مشاغل کا مثبت اور تعمیری ہونا لازمی امر ہے۔تعلیم کے ساتھ ساتھ سیر وتفریح اور مختلف کھیلیں اُن کی جسمانی ساخت کو مضبوط تر بناتے ہیں اور ذہنی پختگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔تفریح کے معاملے میں یہ حقیقت ہر بچے پر واضح ہونی چاہیے کہ کسی بھی اخلاقی اور قانونی حد سے تجاوز کرنا تفریح نہیں بلکہ بغاوت اور بے راہ روی میں شمار ہوتا ہے۔اسی طرح ایسی تمام سرگرمیاں اور کھیل کود جو وقت کے ضیاع یا اخلاقی وجسمانی نقصان کا سبب بن سکتے ہیں، ان سے احتراز ضروری ہے۔

لڑکپن میں خواہ لڑکا ہو یا لڑکی سکول کی سطح پر بچوں کو دورانِ تدریس ایسے اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے جو نصاب کی کتابوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ باقاعدگی سے ان کی روحانی، جسمانی اور جذباتی تربیت پر مثبت اثرات مرتّب کریں۔اساتذہ کرام جو بچوں اور بچیوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک روحانی باپ کا درجہ رکھتے ہیں، ان کے ہر مسئلے کو سلجھانے میں ان کی مدد کریں تاکہ بچے بلا جھجک اپنا ہر مسئلہ ان کے سامنے پیش کر سکیں۔بچوں کو سکول میں ایسا ماحول فراہم کیا جائے کہ انھیں کسی قسم کے عدم تحفّظ کا احساس نہ ہو، تاکہ وہ نہایت سکون سے تعلیم وتربیت کے مراحل طے کر سکیں۔

۱۳ بدعنوانی (کرپشن) سے نجات

بدعنوانی انگریزی زبان کے لفظ Corruption کا اردو معنی ہے۔ ہر وہ برائی جو معاشرے میں کسی بھی قسم کے فساد کا باعث بنے ''کرپشن'' کہلاتی ہے۔ سود خوری، رشوت ستانی، سفارش، وعدہ خلافی، جھوٹ، ملاوٹ، تعصّب، اقربا پروری، بد دیانتی، ہر طرح کی چوری اور دیگر تمام سماجی بُرائیاں کرپشن ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ اگر ہم ایک خوش حال، منظم اور پُر امن معاشرہ چاہتے ہیں تو ان تمام بُرائیوں سے نجات ناگزیر ہے۔ دینِ اسلام نہ صرف تمام قسم کی کرپشن کو ختم کرنے کی تاکید کرتا ہے بلکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کی سیرتِ اقدس کی پیروی کی تلقین بھی کرتا ہے جو ایسے تمام پہلوؤں سے سجی ہوئی ہے جن کی پیروی کر کے تمام معاشرتی برائیوں سے بچا جا سکتا ہے اور معاشرے کو خوش حال اور مثالی بنایا جا سکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے ان (اعمال) کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمائے۔'' (سورۃ الروم، آیت: ۴۱)

دراصل انسان حرص و ہوس کی رو میں بہ کر اور خواہشات کا غلام بن کر ایسی تمام حدیں پار کر جاتا ہے جہاں سے کسی بھی برائی کا آغاز ہوتا ہے۔ ضرورت کے بجائے سہولت کی تلاش اور سہولت کے بجائے تعیّشات کا تعاقب انسان کو سماجی برائیوں کی طرف راغب کر دیتے ہیں۔ انسان ناجائز طریقے سے ہر وہ چیز حاصل کرنا چاہتا ہے جس پر اس کا حق نہیں ہوتا۔ ان ناجائز ہتھکنڈوں میں رشوت ستانی اور سفارش زیادہ فساد برپا کرنے والے افعال ہیں۔

رشوت کسی بھی معاشرے کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتی ہے۔ مختلف محکموں کے ملازمین رشوت لیے بغیر کسی بھی سائل کا جائز کام کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے اور رشوت کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف سائل بھی اپنے جائز یا ناجائز کام کے لیے لوگوں کی مٹھیاں گرم کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔ اس طرح مرتشی اور راشی دونوں رشوت کا بازار گرم کرنے میں پیش پیش نظر آنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ اسلامی تعلیمات میں واضح طور پر آیا ہے کہ:

''رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا، دونوں جہنمی ہیں۔'' (طبرانی: ج ۱/ ص ۵۷۹)

رشوت کے عام ہونے کی بے شمار وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ دینِ اسلام سے دوری اور سنتِ نبوی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم سے انحراف ہے۔ دوسری وجہ مذہبی اور سماجی اقدار کی عدم پیروی ہے۔ ہم لالچ اور حرص و ہوس میں آ کر اپنی شان دار اقدار کو پامال کر دیتے ہیں، جس کا نتیجہ رشوت ستانی کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں غربت اور جہالت بھی رشوت ستانی کے بڑے اسباب ہیں۔ رشوت کی دلدل میں دھنسا شخص کرپشن کو اپنے لیے ہنر اور فن سمجھتا ہے۔ اس پہلو کی طرف زمانہ حال کے مقبول مزاحیہ شاعر انور مسعود نے کیا خوش گوار انداز میں توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کروں گا کیا جو کرپشن بھی چھوڑ دی میں نے
مجھے تو کوئی اور کام بھی نہیں آتا

رشوت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اور معاشرے کو اس سماجی بُرائی سے پاک کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں احکامِ الٰہی اور رسولِ اکرم خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرت کو اپنانا ہوگا۔ اپنے ملک میں تعلیم کو عام کرنا ہوگا اور بہترین اقدار کو رواج دینا ہوگا۔ رشوت خوری دور کرنے کے لیے کسی بھی درخواست، مقدمے یا فائل پر عمل درآمد کے لیے ایک محدود مدّت مقرر کی جانی چاہیے تاکہ سائل کو بار بار چکر نہ لگانے پڑیں اور اپنا جائز کام کرانے کے لیے بھی رشوت کی پیش کش نہ کرنی پڑے۔ عدل وانصاف کے تمام تر تقاضے اگر کوئی معاشرہ پورا کرے تو یقیناً رشوت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ہمیں اور ہمارے بڑوں کو ایک رول ماڈل بن کر دوسروں کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ ہمیں معاشرے میں یہ احساس پیدا کرنا ہوگا کہ رشوت ایک لعنت ہے، یہ ہمارے معاشرے اور ہماری اولادوں کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

اے طائرِ لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

رشوت ستانی کے علاوہ سفارش بھی ایک بہت بڑی سماجی بُرائی ہے۔ رشوت کی طرح اس کا استعمال بھی اگر ناجائز کاموں کے حصول کے لیے کیا جائے تو انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ بھی معاشرے میں ایک بڑا فساد برپا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جب ہم سفارش کے بل بُوتے پر کسی دوسرے کو اُس کے حق سے محروم کرکے ناحق کسی عہدے، جائیداد یا سامان وغیرہ پر قابض ہوں گے تو یہیں سے معاشرتی عدم استحکام کا آغاز ہوجائے گا۔ سفارش کی بیماری جس معاشرے میں عام ہوجائے وہاں غریب بے بس اور کمزور لوگ پس کر رہ جاتے ہیں، جب کہ وہ لوگ جن کے تعلقات بڑے بڑوں سے ہوتے ہیں، سفارش اور تعلق کی بنا پر ناجائز کام کروا لیتے ہیں۔ یوں بے شمار نااہل افراد اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوکر مختلف اداروں میں اپنی نااہلی کی وجہ سے ترقی کے سفر کو روک دیتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرتی اور ملکی قوانین کو دینِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے۔ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کا طرزِ معاشرت اپناتے ہوئے رشوت اور سفارش کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی بدعنوانی کا خاتمہ کیا جائے۔ ہر مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے اور ایسے تمام عناصر کا احتساب کیا جائے جو کرپشن کے حوالے سے کسی بھی گناہ کے مرتکب ہوں۔ عدل وانصاف کو معاشرے میں عام کیا جائے۔ نوکریوں کے سلسلے میں میرٹ اور اہلیت کو فوقیت دی جائے۔ تعلیم کو عام کرکے معاشرتی شعور کو بیدار کیا جائے، جائز وناجائز اور حلال وحرام کے فرق کو لوگوں کے اذہان وقلوب میں بسایا جائے۔ اس کے لیے میڈیا کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم سچے اور پکے مسلمان بن جائیں اور حُب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو یقیناً ہمارا معاشرہ اور ہمارا ملک تمام برائیوں سے پاک ہوسکتا ہے۔

⑫ پاکستان چین اقتصادی راہداری

پاکستان اور چین کے تعلقات باہمی مفادات پر مبنی ہونے کے باوجود درحقیقت دونوں ممالک کے مابین محبت بھرے گہرے جذبات کے ترجمان ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان چین تعلقات بحرالکاہل سے زیادہ گہرے اور کوہِ ہمالیہ سے زیادہ بلند ہیں، تو یہ بالکل بجا ہے۔

پاکستان چین اقتصادی راہداری ۴۶ ارب ڈالر مالیت کا دوطرفہ منصوبہ ہے۔ گمان ہے کہ یہ منصوبہ تکمیل پذیر ہونے کے بعد خطے کے لیے گیم چینجر (Game Changer) ثابت ہوگا۔ یہ اقتصادی منصوبہ تین ہزار کلومیٹر شاہرات کے ذریعے چین کے شہر کاشغر کو پاکستان کی جدید بندرگاہ گوادر سے منسلک کر دے گا۔ کاشغر چین کی اکثریت مسلم آبادی کے صوبے سنکیانگ کا دارالحکومت ہے اور یہ وہی شہر ہے جو قدیم زمانے میں شاہراہ ریشم پر اہم ترین پڑاؤ رہا ہے اور جس کے بارے میں مفکرِ مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

پاکستان اور چین دونوں ممالک کے اقتصادی ماہرین کا بڑے وثوق کے ساتھ کہنا ہے کہ اس ربط ضبط کے بڑے دور رس اقتصادی اثرات مرتب ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی شاہراہ کے ساتھ ساتھ بالائی ڈھانچے کے طور پر دوسرے ترقیاتی منصوبے بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔

پیپلز ری پبلک آف چائنا (چین) نے قومی حمیت اور عزم و حوصلہ کی بنا پر اپنی اقتصادی طاقت کا لوہا دنیا بھر سے منوایا ہے۔ دونوں سُپر پاورز یعنی امریکہ اور روس کے علاوہ یورپی یونین، ایشیا اور آسٹریلیا کے لوگ اس ملک کی طرف حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ چین جب اپنے تمام منصوبے مکمل کر لے گا تو اس کی ہمہ جہت صلاحیت میں حیرت انگیز اضافہ ہو جائے گا مگر سرِ دست ہمارا روئے سخن فقط چین پاکستان اقتصادی راہداری کی طرف ہے اور ہم اس امر پر اجمالی روشنی ڈالیں گے کہ اس منصوبے کی دونوں ملکوں کے لیے کس قدر اہمیت و افادیت ہے۔

ظاہر بات ہے کہ چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے کی وجہ سے چین کو بحرِ ہند کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل ہو جائے گی اور اسے مشرق وسطیٰ سے توانائی کی درآمدات میں سہولت میسر آ جائے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی چند اقدامات اٹھانے سے شدید توانائی بحران سے نجات مل جائے گی۔ اس منصوبے کی وجہ سے پاکستان میں واٹر، سولر اور تھرمل پاور پلانٹس کی یکے بعد دیگرے تنصیب ہو رہی ہے جس کی وجہ سے پاکستان کو ۳۴ ارب ڈالر کی بچت ہوگی۔ اس منصوبے میں ایران، روس اور سعودی

عرب کی شمولیت کی شدید خواہش نے اس کی اہمیت دو چند کر دی ہے۔ یہ اقتصادی منصوبہ ترقی پذیر پاکستان کے لیے امکانات کی ایک وسیع کائنات ہے۔ پاکستان کی ہمہ جہت اقتصادی ترقی کے سوتے اسی منصوبے سے پھوٹیں گے۔ اس معجز نما اقتصادی کرشمے کا ایک بڑا حصہ کوہِ قراقرم کے سنگلاخ اور دشوار گزار ترین پہاڑی سلسلے کے دروں سے گزرتا ہے۔ ان راستوں سے سڑک گزارنے میں بے شائبہ و بلا مبالغہ خونِ جگر شامل ہوا ہے۔ جس کسی نے ان راستوں سے سفر کیا ہے، اسے علامہ اقبال کا یہ شعر جو انھوں نے ہسپانیہ میں مسجدِ قرطبہ کی حیرت انگیز تعمیر کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ضرور ذہن میں آتا ہے:

نقش ہیں سب نا تمام ، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام ، خونِ جگر کے بغیر

سی پیک کے منصوبے کا، جسے ہم نے معجز نما کہا ہے، ایک دوسرا پہلو، جواب تک پوری توجہ حاصل نہیں کر سکا، یہ ہے کہ اس کی بدولت پاکستان کی بحری قوت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ سی پیک کے تحت چین پاکستان کو آٹھ ایٹمی آبدوزیں دے رہا ہے، جو ہماری بحریہ کی صلاحیت کو مزید فعال اور مستحکم بنا دیں گی۔

فی زمانہ گوادر بندرگاہ کو تجارتی مقاصد کے لیے ترقی دی جا رہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب اسے دفاعی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے سے پاکستان کے چاروں صوبوں کو معاشی فوائد حاصل ہوں گے اور اس سے یقیناً وطنِ عزیز میں مجموعی طور پر خوشحالی کے دور کا آغاز ہوگا۔

انتہا پسندی، دہشت گردی، غربت، جہالت اور بے روزگاری کا خاتمہ، اس منصوبے کے وہ ثمرات ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سی پیک منصوبے سے پاکستان کے آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک، امریکہ اور دوسرے ممالک پر معاشی انحصار کی ضرورت نہیں رہے گی۔ گویا یہ منصوبہ ہماری معاشی آزادی کی مضبوطی کی ضمانت ہے اور یہ بات کہنے میں کوئی خوفِ تردید نہیں ہے کہ یہ منصوبہ ہماری معاشی ترقی اور خوشحالی کا پاسپورٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت نے جو ہمیں اپنا بڑا دشمن گردانتا ہے اور ہمیں زک پہنچانے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا، سی پیک منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لیے تیس کروڑ ڈالر مختص کیے ہیں اور اس حوالے سے اپنی تخریب کارانہ سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا ہے جس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ایک تو اس نے مقبوضہ کشمیر میں نہتے کشمیریوں پر ظلم و بربریت کا سلسلہ بڑھا دیا ہے، دوسرے ایل او سی (لائن آف کنٹرول) پر چھیڑ خانی شروع کر دی ہے اور تیسرے اس منصوبے کے بحری راستے میں بدمعاشی پر کمر بستہ ہے۔ چند روز پہلے ایک بھارتی آبدوز ہمارے پانیوں میں گھس آئی مگر ہماری بحریہ کو چوکنا دیکھ کر اسے راہِ فرار اختیار کرتے بنی۔ چونکہ سی پیک منصوبے کی کامیاب تکمیل کی گارنٹی ہماری مسلح افواج نے بطور ادارہ دی ہے، اس لیے ابھی تک بھارت کی مذموم سرگرمیاں مسلسل ناکامیوں سے دو چار ہو رہی ہیں۔ ہم بطور پاکستانی قوم اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ پاکستان کی مجموعی ترقی و خوشحالی ہمارے ازلی دشمنوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ تھوڑا سا مزید انتظار کریں، اس منصوبے کی وجہ سے پاکستان کا آنے

والا کل انھیں ایسی کئی مزید حیرتوں سے دوچار کرے گا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گوادر کے بارے میں، جو سی پیک منصوبے کا محور ہے، مختصراً چند حقائق بیان کیے جائیں۔ گوادر میں سارا سال تیز و تند ہواؤں کا راج رہتا ہے، اس لیے اس جگہ کا نام گوادر پڑ گیا۔ کل تک گوادر غریب مچھیروں کی بستی تھی اور یہ خطہ سلوقی سلطنت کا حصہ تھا اور اس علاقے کے لوگوں کو ''ماہی خوراں'' کہا جاتا تھا، ہوتے ہوتے یہی لفظ ''مکران'' بن گیا۔ ابتدا میں بلوچستان کا نام بھی مکران تھا اور شاید اس بنا پر ابھی تک اس ساحلی پٹی کو ساحل مکران کہا جاتا ہے۔ گوادر کراچی سے مغرب کی جانب سات سو کلومیٹر کی دوری پر اور خلیج فارس سے مشرق کی جانب ساڑھے تین سو کلومیٹر دور واقع ہے۔ ایرانی بندرگاہ چابہار سے اس کا زمینی فاصلہ تقریباً ایک سو کلومیٹر ہے جو ۶۷ نوٹیکل بنتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ گوادر ایسا علاقہ شمار ہوتا تھا جہاں سیکڑوں میل تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد، ایک طرف تاحدِ نگاہ ریت کے ٹیلے تو دوسری جانب قدرت کا بیش بہا عطیہ یعنی آئینے کی طرح صاف و شفاف اور وسیع و عریض سمندر کی فلک شگاف شور مچاتی جھاگ اڑاتی لہریں جو چٹانوں سے سر ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اس علاقے کو، جو کسی زمانے میں سلوقی سلطنت کا حصہ شمار ہوتا تھا اور مغلوں کی عظیم سلطنت کا حصہ بھی رہا، نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ خان آف قلات نے جب اپنی بیٹی کی شادی سلطنتِ عمان کے شہزادے سے کی تو گوادر کو ایک شکارگاہ کے طور پر بیٹی کے جہیز میں دے دیا چنانچہ ایک عرصے تک گوادر سلطنت عمان ہی کا حصہ رہا۔ حکومتِ پاکستان نے اسے پچاس سال پہلے سلطنت عمان سے خرید کر یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو صوبہ بلوچستان میں ضلع گوادر کے طور پر ضم کر دیا۔

مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اب انھیں اپنے اور اپنی اولاد کے تابناک مستقبل کے لیے زمانے کا ساتھ دینا ہوگا اور اگر اب بھی وہ پرانی ڈگر پر چلیں گے تو یہ ان کی ناسمجھی ہوگی۔ انھیں قدرت کے اس شاندار عطیے پر خداوند کریم کے بعد اپنے وطنِ عزیز کی حکومت اور چین کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کا علاقہ جلد ہی ترقی یافتہ دنیا کے شانہ بشانہ چلے گا۔

گوادر پورٹ کے بروئے کار آنے پر پاکستان اقتصادی لحاظ سے ''ٹیک آف'' کی پوزیشن میں آ گیا ہے۔ یہ تاریخی منصوبہ پاکستان کی مجموعی معاشی ضروریات کا وہ حتمی علاج ہے جسے قوم نے بالآخر اپنے آزمودہ دوست چین کی مدد سے پا لیا ہے۔ اس معجزاتی اور کرشماتی منصوبے کا مرکز و محور، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ہمارا صوبہ بلوچستان ہے۔ سی پیک اور گوادر پورٹ کے معاملے میں بلوچ عوام کی سوچ کو مثبت کرنے اور انھیں درست طریقے سے فوائد پہنچانے کے لیے فوری طور پر حب سے لے کر چمن و ژوب تک ہر ضلع میں ایسے ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹرز قائم کیے جا رہے ہیں جہاں مکینیکل، الیکٹریکل، الیکٹرونکس، ریفریجریشن اور ٹیلی کمیونیکشن سمیت تمام ممکنہ شعبوں میں میٹرک پاس طلبہ و طالبات کو تعلیم دی جائے گی۔ یہ بات طے پا گئی ہے کہ ان ٹیکنیکل سنٹرز کو ہنگامی طور پر سی پیک

منصوبے کی تحت قائم کر کے ہر ضلع میں چینی زبان کی تعلیم کا فوری طور پر آغاز کیا جائے۔ بلا شبہ دبئی آج ایک بین الاقوامی شہر اور دنیا بھر کے لیے نمایاں تجارتی مرکز بن چکا ہے۔ دبئی نے اپنی بندرگاہ اور ائیر پورٹ کو ٹیکس فری قرار دے کر ایسی پالیسیاں تشکیل دی ہیں کہ یہ جگہیں دنیا بھر کی تجارتی سرگرمیوں کا محور بن گئی ہیں۔ ہمیں گوادر کو انھی خطوط پر ترقی دینا ہوگی۔ اس کے لیے ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم گوادر میں میٹھے پانی کی فوری فراہمی کے منصوبوں کو ہنگامی بنیادوں پر مکمل کریں۔ اس کے علاوہ ایسے اقدامات اٹھانے کی بھی ضرورت ہے جس سے گوادر جدید شہری سہولتوں سے آراستہ ہو سکے۔ ہمیں مجموعی طور پر بلوچستان کے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کو اولین ترجیح بنانا چاہیے تا کہ وہ لوگ اس منصوبے کے شیریں ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔ بلوچستان میں تعلیم کی طرح صحت کی سہولیات بھی ناپید ہیں چنانچہ اس طرف بھی بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سی پیک ضمنی منصوبوں میں سرکاری ملازمتوں کی میرٹ پر فراہمی بھی ایک ایسا ناگزیر اقدام ہے جس پر عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر بلوچی عوام کا میعارِ زندگی بلند ہوگا تو ہمارا دشمن انھیں ملک وملت کے خلاف استعمال نہیں کر سکے گا۔

بفضلِ تعالیٰ گوادر دنیا کے سب سے بڑے بحری تجارتی راستے پر واقع ہے جو اپنے قدرتی شاندار محلِ وقوع اور زیرِ تعمیر جدید ترین گہرے پانیوں کی بندرگاہ کے باعث عالمی سطح پر معروف ہے۔ آنے والے وقت میں نہ صرف پاکستان بلکہ چین، افغانستان اور وسط ایشیا کے ممالک کی بحری تجارت کا دارومدار اسی بندرگاہ پر ہوگا اور ہمیں یہ معجزہ دکھانا ہوگا کیونکہ بقول علامہ اقبال:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا ، وہ ہنر کیا !

۱۵ توہم پرستی اور ہمارا معاشرہ

آج کا دَور انسانی ترقّی کے عروج کا دور ہے۔ انسان چاند پر قدم جمانے کے بعد سے نئے سیاروں اور اَن دیکھے جہانوں کی کھوج اور اُن تک رسائی میں لگا ہوا ہے۔ ایک طرف تو یہ اور دوسری طرف جدید ذرائع نے دُنیا کو گلوبل ویلیج بنا کر رکھ دیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھا کوئی بھی شخص کسی دوسرے شخص سے لمحوں میں ہم کلام ہوسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان ذرائع کے سبب دنیا بھر کی معلومات تک رسائی ایک کلِک کی دُوری پر دھری رہتی ہے۔ سائنسی ترقی کی اس معراج پر بھی انسان تہذیبی اور معاشرتی سطح پر کئی حوالوں سے زوال کا شکار چلا آرہا ہے۔ ان میں سے ایک بُرائی جو دوسرے معاشروں کی نسبت ہمارے معاشرے میں کم ہونے کا نام نہیں لے رہی، وہ ہے ''توہّم پرستی''۔ سائنس کی بنیاد عقل اور عقلی دلائل پر ہوتی ہے جب کہ توہّم پرستی کا کوئی عقلی جواز موجود نہیں ہوتا۔ لفظ ''توہّم پرستی'' کے لغوی معنی بھی وہم کی پرستش یا پوجا اور خلافِ عقل باتوں کو تسلیم کرنا کے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ توہّم پرستی کے جال میں اس قدر اُلجھ چکا ہے کہ اس سے چُھٹکارا پانا جوئے شیر لانے کے مترادف لگتا ہے۔

لوگ جہالت، کم عِلمی، دینی شعار سے غفلت اور اسلامی تعلیمات سے دُوری کے باعث اپنی مذہبی اقدار و روایات کو پسِ پُشت ڈالتے ہوئے اندھا دُھند توہّم پرستی کا پرچار کرنے والوں کا شکار ہو گئے ہیں اور جعلی عاملوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ انسان تو انسان وطنِ عزیز میں تو جانوروں اور پرندوں کے ناموں تک سے دلی مرادیں وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ اس سائنسی دور میں اس طرح کے واہموں کی قطعاً گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم عطا کی ہے، اُسے اچھائی، بُرائی کا شعور دیا ہے۔ حق اور باطل میں تمیز کرنے کے لیے انبیاء و رسل بھیجے گئے اور آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔ روحانی بالیدگی اور ذہنی و فکری نشوونما کا نتیجہ یہ ہے کہ دِلوں سے خوف، ڈر اور نفع نقصان کے اندیشے نکال دینے چاہییں۔

وہ مُسلم معاشرہ جس کی بنیاد ہی یقین اور تقویٰ پر ہے اور جن کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی اجازت اور علم کے بغیر یہاں پتّا بھی حرکت نہیں کرسکتا۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور کوئی بھی مخلوق اُس کے منصب تک پہنچنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ وہ خالق ہے اور اپنی مخلوق کا سوال کرنا، مخلوق کا اللہ سے اُمیدیں وابستہ کرنا اور پھر نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا انھیں بے حساب نوازنا اس ذاتِ باری تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اس نے انسانوں کو جس لغزش، خطا یا گناہ سے بار بار متنبہ کیا ہے، وہ شِرک ہے، انسانی زندگی کا یہ واحد گناہ ہے جس کی معافی نہیں ہے۔

اس عقیدۂ توحید کا پیروکار ہونے کے باوجود ہم لوگ اگر توہّم پرستی کا شکار ہو رہے ہیں تو یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ہم نہ صرف اپنے عقائد سے رُوگردانی کر رہے ہیں بلکہ ان خرافات میں پڑ کر اپنا وقت اور پیسا دونوں برباد کر رہے ہیں۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق سے رجوع کریں یا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی زندگیوں پر نظر کریں تو پتا چلتا ہے کہ ان غیر اسلامی رویّوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں نہ صرف غریب اور اَن پڑھ طبقہ دین میں ملاوٹ اور خرابی کا باعث ہے

بلکہ معاشرے کا بظاہر پڑھا لکھا اور باشعور ہونے کا دعویٰ کرنے والا ایک وسیع حلقہ بھی ان خرافات کا شکار ہے۔ ان غیر اسلامی اور غیر عقلی تصوّرات کے راسخ ہونے کی وجہ سے اُمّتِ مسلمہ زوال وادبار کا شکار ہوگئی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اپنی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' میں لکھا:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

جب صورت یہ بنی تو اقبال رحمہ اللہ نے ساقی نامہ میں ہی اُمّتِ مسلمہ کے زوال کا نقشہ ان لفظوں میں کھول کے رکھ دیا:

بجھی عشق کی آگ ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں ، راکھ کا ڈھیر ہے

ہم لوگ اپنی مذہبی اقدار کو اس قدر کھوکھلا کر چکے ہیں کہ شر پسند عناصر ان کا فائدہ اٹھا کر ہمیں ہمارے اپنے لوگوں کے خلاف کر رہے ہیں اور ہم ان کے ہاتھوں کٹھ پُتلیاں بنے ان کے اشارۂ ابرو پر رقص کناں ہیں۔ شہروں کا حال بھی دیہاتوں سے کچھ مختلف نہیں۔ کہیں ساس اپنی بہو کے خلاف تعویذ گنڈے کروا رہی ہے تو کہیں بہُو اپنی ساس کا ناطقہ بند کرنے کے لیے جعلی پیروں فقیروں اور عاملوں کی جیبیں گرم کر رہی ہے۔ کچھ معصوم لوگوں کو اولادِ نرینہ کے نام پر لُوٹا جا رہا ہے اور کچھ لوگ فکرِ معاش سے تنگ آ کر ان پیروں فقیروں اور عاملوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو رہے ہیں۔

بعض لوگ اس حد تک اخلاقی زوال کی پاتال میں گر چکے ہیں کہ اپنے مذموم مقاصد کی خاطر لوگوں کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دیہاتوں میں لوگ سُودی قرضے لے کر اپنے مقدمات کے حسبِ منشا فیصلے کروانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جعلی پیروں کا کاروبار چمکاتے دکھائی دیتے ہیں۔

توہّم پرستی کی ایک اور قسم جس کا شکار ہمارا معاشرہ ہو رہا ہے اور جو اس دور میں زمانۂ جاہلیت کی تصویر پیش کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آج بھی بیٹی کو بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔ بیٹی کے پیدا ہونے پر آنسو بہائے جاتے ہیں اور رشتہ دار باقاعدہ افسوس کرنے آتے ہیں۔ بیٹے کی آرزو کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ شوہر کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے تعویذ دھاگوں کا سہارا لیا جاتا ہے جب کہ گھر میں ہر وقت افراتفری میں رہتا ہے۔ مزید برآں اور کچھ نہ ہو تو مختلف توہّمات کے نتیجے میں کئی کام روک دیے جاتے ہیں۔ بعض دِنوں کو منحوس قرار دیتے ہوئے سفر سے گریز کیا جاتا ہے اور بعض دنوں کو سعد تصور کرتے ہوئے ضروری کام انجام دینے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

توہّم پرستی کی زندہ مثالیں ہمیں اپنے معاشرے میں ملتی ہیں مثلاً: اگر کالی بلّی راستہ کاٹ جائے تو اُس راستے پر جانا درست نہیں سمجھا جاتا، کانچ کا برتن ٹوٹ جائے تو اسے بُرا شگون سمجھا جاتا ہے۔ گھر کی مُنڈیر پر کوّا کائیں کائیں کرے تو اسے مہمان کی آمد کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ انڈین ٹیلی ڈراموں اور فلموں نے ان توہّمات کو مزید فروغ دیا ہے جس کے ہمارے معاشرے پر بدترین

اثرات مُرتب ہورہے ہیں۔

بجائے اس کے کہ ہم اس کی اصلاح کریں ہم آئے دن توہّم پرستی کا شکار ہوکر اپنے مقاصد سے دُور ہوتے جارہے ہیں جو کہ ہمارے معاشرے کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

توہّم پرستی ہمارا طرزِ احساس اور طرزِ حیات بن چکی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ توہّم پرستی ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، جو لوگوں کو نئی ٹیکنالوجی اور نئے تغیرات کو قبول نہیں کرنے دیتی۔ لوگ فرسودہ رسوم ورواج کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ یہ افسوس ناک صورتِ حال نہ صرف معاشرتی طور پر بلکہ معاشی اور سیاسی طور پر بھی ہمارے معاشرے کو کمزور کررہی ہے۔

معاشرے کے تمام طبقات کو بیدار ہونا ہوگا اور ایسے اقدامات اٹھانا ہوں گے جو لوگوں کو توہّمات کی پُرفریب دُنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا سے رُوشناس کرائیں۔ ایک باشعور اور صحیح الفکر معاشرے کا قیام ہمارا اولین مقصد ہونا چاہیے۔ یہ ملک وقوم کی ترقی اور سالمیت کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ عوام ان توہمات کی دلدل سے نکل کر پاکستان کو درپیش مسائل کا مقابلہ مکمل یکسوئی اور تن دہی سے کرسکیں۔ اس طرح کی سماجی بُرائیوں کے خاتمے کے لیے معاشرے کے ہر فرد اور ادارے کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

۱۶ اُردو کی مقبولیت کے اسباب

اردو اس وقت دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں چینی اور انگریزی کے بعد تیسری بڑی زبان اردو ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے دنیا کے تقریباً ہر خطے اور ہر ملک میں موجود ہیں اور اس کے حلقۂ اثر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ انگریزی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک بھر میں رابطے کی واحد زبان ہے۔ اگرچہ پاکستان میں صوبائی سطح پر پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی اور پوٹھوہاری وغیرہ بولی جاتی ہیں مگر ان کا دائرہ اثر صرف مقامی سطح تک محدود ہے جب کہ اردو واحد زبان ہے جو طورخم سے کراچی تک سمجھی، بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ بلکہ بھارت، بنگلہ دیش اور سارک کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی مقبولیت کچھ کم نہیں۔ یہاں کے بیشتر باشندے، بالخصوص شہری آبادیوں میں رہنے والے اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں ہے۔ گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جنوبی ایشیا میں اردو وہ زبان ہے جسے طورخم سے چٹاگانگ اور کوہ ہمالیہ سے لے کر جزائر مالدیپ تک قبولِ عام کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک اور یورپ، امریکہ، کینیڈا، افریقہ، آسٹریلیا اور ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دنیا کی بیشتر معروف یونیورسٹیوں مثلاً کیمبرج یونیورسٹی، آکسفورڈ یونیورسٹی، کنگز کالج لندن، لندن یونیورسٹی، کولمبیا یونیورسٹی، شکاگو یونیورسٹی، انٹرنیشنل یونیورسٹی کیلیفورنیا، میک گل یونیورسٹی کینیڈا وغیرہ میں ضرورت کے تحت اردو کی تدریس کے شعبے قائم ہیں، جن میں اردو سیکھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ لطف یہ ہے کہ متذکرہ یونیورسٹیوں کے علاوہ بھی دنیا کی کئی اور یونیورسٹیوں میں اردو میں پی ایچ۔ ڈی تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں بھی دوسرے ملکوں سے طلبہ اردو پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں اردو جاننے اور بولنے والوں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ ارب سے متجاوز ہے جو اردو کی عام مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اردو بجائے خود ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی لشکر یا فوج کے ہیں۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں جو شاہی لشکر دہلی میں مقیم رہا وہ اردو یا اردوئے معلیٰ کہلاتا تھا اور چونکہ یہ زبان لشکری بولتے تھے۔ اس لیے یہ زبان اردو کہلائی۔ اسی لیے پہلے پہل ثقہ قسم کے لوگ اس میں بول چال کرنے سے بچنے کی کوشش کرتے اور اس کے لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمتے گئے۔ مغلیہ سلطنت کے دورِ انحطاط میں اس میں خوب نکھار پیدا ہوا۔ عوام کے ساتھ ساتھ خواص نے بھی اسے اپنایا۔ شعرا نے اسے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور اس میں بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی نئی تراش خراش سے اسے خوب آراستہ و پیراستہ کر دیا۔ مغلیہ

سلطنت کے زوال کے بعد برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ انگریز ہندو اور مسلمانوں دونوں سے الگ بالکل ایک غیر اور اجنبی قوم تھی جو سات سمندر پار سے آئی تھی۔ اس کی زبان، اس کی تہذیب، اس کے معاشرتی حالات یہاں سے بالکل جداگانہ تھے مگر اس قوم کے لیے بھی، برصغیر میں مضبوطی سے قدم جمانے کے لیے، سوائے اردو کا سہارا لینے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس طرح غیر محسوس طریقے سے انگریز بھی اردو کی ترویج و اشاعت کا تیسرا بڑا سبب ہوئے۔

اردو بلاشبہ ایک مرکب زبان ہے لیکن ہندی نژاد ہے۔ جس پر عربی، ترکی، فارسی اور انگریزی کے اثرات سب سے زیادہ ہیں۔ مختلف زبانوں کے الفاظ بنیادی عناصر کی صورت میں اس کثرت سے اور اس طرح اردو میں داخل ہو گئے ہیں کہ اب انھیں اس مرکب سے علیحدہ کرنا محال ہے اور شاید اسی وجہ سے اردو کا یہ مزاج بن گیا ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر بآسانی جذب کر لیتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر شخص کے لیے ایک انجانی سی کشش ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو جن جن زبانوں سے مل کر بنی ہے ان تمام زبانوں کی بیشتر خوبیاں بھی اس میں آ گئی ہیں۔ مثلاً ہندی میں یہ خوبی ہے کہ اس کے الفاظ نرم و شیریں اور کومل ہیں اور ان میں ایک دل آویزی موجود ہے۔ عربی میں جو فصاحت و بلاغت ہے وہ کسی دوسری زبان میں نہیں۔ فارسی میں شیرینی کے ساتھ ساتھ ایک شان ہے۔ چنانچہ یہ تمام خوبیاں اردو میں موجود ہیں۔

اردو کا بنیادی ڈھانچا اگرچہ مقامی خمیر سے تیار ہوا ہے لیکن یہ اپنی ساخت کے اعتبار سے بین الاقوامی مزاج کی مخلوط زبان ہے۔ اردو میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، ہندی، عربی، فارسی زبانوں اور مقامی بولیوں کے الفاظ اس کثرت سے داخل ہیں کہ ان کا شمار کرنا محال ہے۔ اس کے علاوہ اس میں انگریزی، اطالوی، پرتگالی، ترکی، جرمن، چینی، سکینڈے نیوین، فرانسیسی، ولندیزی، یونانی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ الفاظ روزمرہ کی تقریر و تحریر میں بے کھٹکے بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دور افتادہ دیہاتوں میں بھی برابر مستعمل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تعداد انگریزی الفاظ کی ہے۔

ان زبانوں کے الفاظ دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ یہ اردو ہی کے لیے بنے تھے اور ان زبانوں کا نام تو ہم محض تکلفاً لیتے ہیں۔ اس سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی کس قدر صلاحیت ہے۔ اردو کے اس مخلوط مزاج ہونے کے نتیجے میں یہ ہوا ہے کہ اردو کے ہر جملے میں کئی کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور ان الفاظ اور جملوں کے سننے والا، چہ جائیکہ اردو سے نابلد ہی کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی حد تک محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ اس زبان سے مانوس ہے یا کچھ نہ کچھ الفاظ سے شناسائی ضرور رکھتا ہے۔ یہ احساس اسے اردو کے قریب تر لانے میں مدد ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جن اجنبیوں نے اردو سیکھنے کی کوشش کی ہے وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ راقم الحروف نے خود دیکھا ہے کہ وہ طلبہ جو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ اردو میں اردو سیکھنے کی غرض سے ایران، چین، جاپان، کوریا، تھائی لینڈ، مصر، سعودی عرب، اردن، عراق، آسٹریلیا، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ سے آتے ہیں، چند ہی مہینوں میں اردو میں اچھی خاصی گفتگو کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اردو کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں

اور اردو لکھنا بھی سیکھ جاتے ہیں۔

اردو میں دخیل الفاظ کئی جہتوں سے اردو میں داخل ہوئے۔ یہ جہتیں کون کون سی ہیں، یہ بحث ایک علیحدہ باب ہے۔ بہر کیف ان دخیل الفاظ کے تفصیلی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اردو میں یہ تین صورتوں سے آئے ہیں: بعض الفاظ جوں کے توں اردو میں داخل ہو گئے ہیں، بعض کا حلیہ اور تلفظ بدل گیا ہے اور بعض الفاظ کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔ لیکن بہر طور اب یہ اردو کے الفاظ ہیں۔ بقول انشاالله خاں انشا: ''ہر وہ لفظ جو اردو میں آ گیا، اردو کا ہے۔'' یہ اصول آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ اس پر نہ کوئی قدغن لگا سکتا ہے اور نہ ہی اردو کا مزاج کسی قدغن کے قبول کرنے کو تیار ہے۔ اس طرح اردو کے سرمائے میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ ہر زندہ زبان کا اصول ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کسی نہ کسی صورت میں قبول کر لیا کرتی ہے لیکن بہر طور اردو میں یہ خاصیت سب زبانوں سے زیادہ ہے۔ اردو کی اس صلاحیت کا اندازہ سب سے پہلے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کو ہوا جو برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی غرض سے آئے۔ ان کی اپنی مادری زبان کچھ بھی رہی ہو مگر وہ عوام میں رہ کر عوام سے عوام کی زبان میں مخاطب ہوئے۔ چنانچہ متاثرین نے ایسے لوگوں کے اقوال، وظائف اور ملفوظات وغیرہ کو حرز جان بنا لیا۔ ان کا یہ فیض آج بھی ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ اسی طرح غیر ملکوں کے سیاحوں کی زبان کے بہت سے الفاظ بھی ملکی زبان کا جزو بنتے رہے اور مغرب سے سفارت کار اور مشنری برصغیر پاک و ہند میں آئے تو انھوں نے بھی اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا کیونکہ اس کے بغیر ان کا گزارہ نہ تھا۔ ان مبلغوں، سیاحوں، سفارت کاروں اور مشنریوں کے ذریعے ہی مختلف اقوام اس زبان سے روشناس ہوئیں اور یہاں کے بہت سے الفاظ ان کی زبانوں میں بھی داخل ہوئے۔ اور ظاہر ہے یہ سب باتیں اردو کی مقبولیت کا باعث بنیں۔

اردو کی مقبولیت کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ چونکہ اردو کا جنم کئی زبانوں کے اتفاقی اختلاط سے ہوا ہے اس لیے ان زبانوں کے حروف ابجد بھی اس میں آ گئے ہیں اور اس وقت اس زبان میں سب سے زیادہ آوازوں کے حروف کا نظام مستعمل ہے۔

اردو کی یہ خاصیت بھی ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ خواہ وہ کسی بھی لہجے اور کیسے ہی مشکل مخرج سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، بآسانی جزوِ بدن ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں ہر ملک کی آب و ہوا کا لطف اور ہر موسم کا سماں موجود ہے۔ یہاں کے باشندے جس زبان کو چاہتے ہیں اس میں جلد ہی اس قدر مہارت پیدا کر لیتے ہیں کہ اس کے اہل زبان بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ اور تو اور یہاں کے بعض پرندوں کو بھی یہ ملکہ حاصل ہے کہ آپ ذرا سی محنت سے انھیں دنیا کی ہر زبان سکھا سکتے ہیں اور وہ اس زبان میں جلد ہی بولنے لگتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی مینا اور پاک و ہند کے راطوطے کی بولی پر صاف انسان کا گمان ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر لطف یہ ہے کہ یہاں کے بعض لوگ بعض جانوروں کی بولی بول کر اس خوبی سے نقل کرتے ہیں کہ ان جانوروں کو بھی مخمصے میں ڈال دیتے ہیں۔ اردو کی مقبولیت کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کے مقابلے میں اردو تحریر کم سے کم جگہ اور وقت لیتی ہے۔

اس کے علاوہ اردو میں یہ وصف بھی ہے کہ اس میں مصدر سازی کے ایک نہایت کارآمد نظام کا سلسلہ موجود ہے یعنی اردو کے

لازم مصادر کو متعدی مصادر میں اور متعدی مصادر کو متعدی المتعدی مصادر میں آسانی کے ساتھ ڈھالا جا سکتا ہے۔ مثلاً: لکھنا سے لکھانا اور لکھوانا، اٹھنا سے اٹھانا، اور اٹھوانا، پکنا سے پکانا اور پکوانا، پینا سے پلانا اور پلوانا، ہنسنا سے ہنسانا اور ہنسوانا وغیرہ۔ مصدر سازی کے اس نظام سے جملوں کی ساخت مختصر اور آسان ہو جاتی ہے اور مفہوم بھی بخوبی ادا ہوتا ہے جب کہ بہت سی زبانوں مثلاً انگریزی میں بھی اس طرح کا کوئی نظام موجود نہیں ہے۔

اردو کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس میں ہم معنی، مترادف اور متضاد الفاظ کثرت سے موجود ہیں جس سے اردو بولنے یا لکھنے والا ان الفاظ کے انتخاب میں ایک طرح کی سہولت پاتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں امدادی افعال کا ایک آسان اور موثر نظام رائج ہے جس کی وساطت سے تحریر و تقریر میں نہ صرف بلاغت اور زور پیدا ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات جو فصاحت اور فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایسا نازک اور پر لطف ہوتا ہے جو بیان میں نہیں آ سکتا اور اس طرح انسانی جذبات بھی آسانی کے ساتھ ادا کیے جا سکتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت اردو میں عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ جبکہ اصطلاحی الفاظ کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ الفاظ کی اتنی بڑی تعداد سوائے انگریزی کے غالباً دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ چنانچہ اردو کا یہ رنگا رنگ ذخیرۂ الفاظ، اس کا بین الاقوامی مزاج، مصدر سازی کے بعض عمدہ اصول، افعالِ معاون کے استعمال کی سہل صورتیں، ہم معنی، مترادف اور متضاد الفاظ کی کثرت وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں جو اردو کو دنیا کی تمام زبانوں میں ممتاز اور مشرف کرتی ہیں اور اس کی مقبولیت کی نئی راہیں کھولتی ہیں۔ اردو ایک سہل المخارج، سریع الفہم، ہمہ گیر، ہمہ صفت موصوف اور مرغوب خاص و عام زبان ہے اور، اردو سمجھنے، بولنے اور لکھنے والوں کے لیے وجہِ افتخار ہے۔